FREDERICK ENGELS

فریڈرک اینگلز

SOCIALISM, SCIENTIFIC AND UTOPIAN

سوشلزم،سائنسی اورخیالی

1878

تعارف: یہ کتاب جیسا کہ فریڈرک اینگلز کے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے اس کی ایک کتاب کے تین ابواب پر مشتمل ہے۔پوری کتاب قاطع دوہرنگ (Anti- Dugring) کے نام سے مشہور ہے۔ جسے فریڈرک اینگلز نے جرمن زبان میں لکھا تھا۔اس کے ایک دوست نے ان تین ابواب کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔فرانسیسی ترجمے کو بہت زیادہ مقبولیت ہوئی۔ چنانچہ بہت تھوڑی مدت میں یہ کتاب کئی ایک یورپی زبانوں میں شائع ہوگئی۔ایڈورڈ ایولنگ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔اسی ترجمےکو اردو میں پیش کیا جارہا ہے۔

سائنسی سوشلزم کے مطالب و معانی سے آگاہ ہونے کے لئے فریڈرک اینگلز کی یہ کتاب بہت مفید ہے۔اس کتاب کے مفہوم سے واقف ہوجانے کے بعد کارل، مارکس فریڈرک اینگلز،لینن،اور دوسرے سائنسی سوشلزم پر لکھنے والوں کی کتابوں کے سمجھنے میں کافی حد تک آسانی پیدا ہوجاتی ہے۔

فریڈرک اینگلز
مختصر حالات زندگی

فریڈرک اینگلز (1820-1895) جرمنی کے ایک کارخانہ دار کا بیٹا تھا۔اس نے بریمن میں ابتدائی پڑھائی کی۔باپ کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا قانون کی تعلیم حاصل کرے لیکن بیٹا شعر وشاعری کی دھن میں تھا۔اسے بہت جلد محسوس ہونے لگا کہ شعروشاعری اس کے بس کا روگ نہیں۔اب نوجوان فریڈرک اینگلز نے ادب اور فلسفہ پڑھنا شروع کردیا۔بیٹے کا یہ طرزِ عمل باپ کو پسند نہ آیا۔ چنانچہ اس نے اینگلز کو بریمن میں کارخانہ کا

تجربہ حاصل کرنے کے لئے بھیج دیا۔ بریمن میں قیام کے دوران اس نے ہیگل کے فلسفہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔

اکیس برس کی عمر میں اینگلز کو فوجی تعلیم حاصل کرنے کے لئے برلن جانا پڑا برلن میں اس نے اپنے آپ کو ہیگل کے شیدائیوں کی جماعت سے وابستہ کرلیا۔ اسی دوران میں اس نے ایک سوشلسٹ اخبار میں فرضی نام سے لکھنا شروع کر دیا۔ دو سال میں فوجی تعلیم ختم ہوگئی۔ اینگلز کو گھر جانا پڑا۔ اسی اثنا میں باپ کو بیٹے کے خیالات کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ اس نے اینگلز کو مانچسٹر بھیج دیا۔

انگلستان جاتے ہوئے فریڈرک اینگلز نے کولون میں کارل مارکس سے ملاقات کی جس میں اینگلز نے کارل مارکس کے اخبار کے لئے لکھنے کا وعدہ کیا۔ انگلستان پہنچنے کے بعد اینگلز اس وعدہ کو پورا کرتا رہا۔ مانچسٹر کے قیام میں اس نے رابرٹ اودین سے ربط ضبط پیدا کیا۔ 1848 میں جرمنی جاتے ہوئے فریڈرک اینگلز نے پیرس میں کارل مارکس سے ملاقات کی۔ دوسری ملاقات کا نتیجہ اس دوستی کی بنیاد تھی جس نے آگے چل کر تاریخی صورت اختیار کر لی تھوڑی مدت تک بریمن میں رہنے کے بعد اینگلز بروسیلز چلا گیا۔ مارکس بھی ان دنوں وہیں تھا۔ پیرس میں '' جرمن کمیونسٹ لیگ '' کے نام سے ایک خفیہ سوسائٹی بن چکی تھی۔ اینگلز نے اس جماعت میں شامل ہوکر پیرس میں رہنے والے جرمن مزدوروں کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ جون ۱۸۴۷ء میں کمیونسٹ لیگ کی پہلی کانگرس (اجلاس) لندن میں ہوئی۔ اسی کانگرس میں فریڈرک اینگلز نے **''دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ''** کا نعرہ بلند کیا تھا۔ اسی کانگریس میں یہ طے پایا تھا کہ کمیونسٹ لیگ کا ایک اعلان نامہ مرتب کیا جائے چنانچہ مارکس اور اینگلز نے مل کر یہ اعلان نامہ مرتب کیا جو '' کمیونسٹ مینی فیسٹو '' کہلاتا ہے۔ فریڈرک اینگلز اور کارل مارکس کولون ہی میں مقیم تھے کہ 1848 میں فرانس میں انقلاب ہو گیا جس کے اثرات آہستہ آہستہ سارے یورپ پر چھا گئے۔ مارکس اور اینگلز جرمنی کی انقلابی تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے۔ جنوبی جرمنی میں مزدوروں اور شاہی فوج میں جو تصادم ہوا اُس نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی۔ مزدوروں کی فوج میں بھرتی ہو کر فریڈرک اینگلز نے چار لڑائیوں میں حصہ لیا۔ اس خانہ جنگی میں مزدوروں کو شکست ہوئی۔ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کو جلا وطن ہو کر لندن جانا پڑا۔ تھوڑی مدت تک مارکس اور اینگلز لندن میں اکھٹے رہے۔ اس کے بعد فریڈرک اینگلز اپنے باپ کے کارخانے میں نوکری کرنے کے لئے مانچسٹر چلا گیا۔ 1870 میں فریڈرک اینگلز لندن چلا آیا۔ اب اس نے سارا وقت لکھنے پڑھنے میں صرف کرنا شروع کر دیا" قاطع دوہرنگ" اسی زمانے میں لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب اینگلز کا عظیم کارنامہ ہے۔ کارل مارکس کی موت کے بعد فریڈرک اینگلز نے ایک طرف تو مارکس کے نا تمام مسودات کو مکمل کیا اور دوسری طرف اس نے بین الاقوامی مزدور تحریک کی رہنمائی کو جاری رکھا۔

ترتیب وپیشکش: ابن حسن

فریڈرک اینگلز

سوشلزم، خیالی اور سائنسی

مندرجات:

پیش لفظ

پہلا باب

دوسرا باب

تیسرا باب

فرہنگ

پیش لفظ

آئندہ صفحات میری کتاب "سائنس میں ہرایوگن دوہرنگ کا انقلاب" کے تین ابواب سے ماخوذ ہیں۔ یہ کتاب 1878 میں لیزگ میں چھپی تھی۔ میں نے ان ابواب کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اپنے دوست پال لنارک کے لئے یکجا کیا تا کہ وہ ان کا فرانسیسی میں ترجمہ کریں۔ یہ فرانسیسی ترجمہ میرے دہرائے جانے کے بعد شائع ہوا۔ اس کے بعد یہ ترجمہ 1880 میں پیرس سے ''خیالی سوشلزم اور سائنیسی سوشلزم'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس فرانسیسی ترجمے سے اس کتاب کا ''خیالی اور سائنسی سوشلزم'' کے نام سے پولستانی زبان میں 1882 میں جنیوا سے ترجمہ شائع ہوا۔ فرانسیسی بولنے والے ملکوں اور خصوصاً فرانس میں لنارک کے ترجمے کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے مجھے خیال پیدا ہوا کہ ان تین ابواب کو اگر جرمن زبان میں چھاپ دیا جائے تو یہ ایک مفید کام ہوگا۔ انہی دنوں زیابیورچ کے "سوزی آل دیموکرات" کے ایڈیٹروں نے مجھے اطلاع دی کہ جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے نئے نئے پراپیگنڈا پمفلٹوں کا مطالبہ کیا جاری رہا ہے اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں انہیں اس مقصد کے لئے ان تین ابواب کے چھاپنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ مجھے ان سے پورا پورا اتفاق تھا۔ اس لئے میں نے کتاب ان کے حوالے کردی۔ اصل میں یہ کتاب فوری مؤثر پروپگنڈے کے لئے نہیں لکھی گئی تھی۔ ایک خالص سائنسی کتاب اس مقصد کے لئے کیونکہ موزوں ہوسکتی تھی؟ ترتیب اور نفسِ مضمون

میں کن تبدیلیوں کی ضرورت تھی؟ جہاں تک ترتیب کا تعلق ہے صرف بے شمار غیر ملکی الفاظ دشواری پیدا کر سکتے تھے۔لیکن کسال بھی اپنی تقریریں اور پروپیگنڈا تحریروں میں غیر ملکی الفاظ سے گریز نہیں کرتا تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس بارے میں کبھی کسی نے شکایت نہیں کی۔اس وقت سے اب تک ہمارے مزدور اخبار بینی میں زیادہ باقاعدہ ہو گئے ہیں۔اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ گنتی میں اخبار پڑھتے ہیں۔اس لئے وہ غیر ملکی لفظوں سے زیادہ مانوس ہو چکے ہیں۔میں نے صرف غیر ضروری غیر ملکی الفاظ نکال دیئے ہیں۔ایسے غیر ملکی الفاظ کی، جن کا استعمال بہت ضروری تھا، میں نے کسی قسم تشریح یا ترجمہ نہیں کیا۔اگر ان غیر ملکی الفاظ کا ترجمہ ممکن ہوتا تو پھر انہیں اصل صورت میں کیوں قبول کر لیا جاتا۔سائنسی اصطلاحات کے ترجمے سے مفہوم بگڑ جاتا۔سلجھاؤ کی جگہ اُلجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ترجمہ کرنے سے کہیں زیادہ مفید ہے کہ ان اصطلاحات کی زبانی وضاحت کر دی جائے! جہاں تک نفسِ مضمون کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اس کے سمجھنے میں جرمن مزدوروں کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔مجموعی طور پر صرف تیسرا باب مشکل ہے۔لیکن اس میں بھی ''تعلیم یافتہ'' سرمایہ داروں کے لئے مزدوروں کی نسبت زیادہ مشکلات ہوگی۔مطالب کی وضاحت کے لئے میں نے کہیں کہیں کچھ تشریحی اضافے کر دیے ہیں۔ایسا کرنے میں میرے پیش نظر مزدوروں سے کہیں زیادہ ''پڑھے لکھے'' ناظرین ہیں جن میں نان امیزن، ہنریش نان سیبل اور دوسرے سرمایہ دار جرمن مورخ شامل ہیں جو بار بار قابو میں نہ آنے والی حسِ سے متاثر ہو کر اپنی تحریروں میں اپنی خوفناک جہالت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔یہ لوگ سوشلزم کے بارے میں بھی بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔اگر ڈان کوئی ہوٹے Don Quxote اپنے نیزے سے پن چکیوں پر حملہ کرتا ہے۔تو وہ اپنا فرض ادا کرتا ہے۔لیکن ہم اس بات کو کبھی برداشت نہیں کر سکیں گے کہ سانچو پانزا Sancho Panza اس قسم کی حرکات کرتا پھرے۔اس قسم کے ناظرین اس بات کو دیکھ کر بھی بہت زیادہ حیران ہوں گے کہ سوشلزم کے ارتقا کی تاریخ میں انہیں کانٹ اور لاپلاس کے نظریۂ آفرینش، موجود طبعی علوم، ڈارون، کلاسیکی جرمن فلسفے اور ہیگل کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ سائنسی سوشلزم اصلاً جرمن ساخت کی ہے۔سائنسی سوشلزم کا ظہور اسی قوم میں ہو سکتا تھا۔جس نے شعوری جدلیات کی روائتوں کو زندہ رکھا ہو...جرمنی تاریخ کے مادی نظریہ اور نئی سوسائٹی میں مزدوروں اور سرمایہ داروں کی کش مکش پر اس کا اطلاق جدلیات کے بغیر ناممکن تھا۔اب جرمن سرمایہ داروں کے اسکول ماسٹر جرمنی کے بڑے بڑے فلسفیوں اور جدلیات کو بُھلا کر بال کی کھال نکالنے میں اس حد تک مصروف ہیں جدلیات کے ثبوت کے لئے طبعی علم کو شاہد بنانا پڑا ہے.....ہم جرمن سوشلسٹ اس بات پر نازاں ہیں کہ ہم نے صرف سین سیموں، فوریئے اور اوون سے اخذ کیا ہے کانٹ، فشطے اور ہیگل کا ترکہ بھی پایا ہے۔

فریڈرک اینگلز

لندن، 21 ستمبر 1882

باب 1

جدید سوشلزم اپنی ماہیت میں نتیجہ ہے ایک طرف نئی سوسائٹی میں موجودہ طبقاتی تضاد اور دوسری طرف اس نراج کا جو پیداوار میں ہے۔ نئے سماج کا یہ تضاد اُجرتی مزدوروں اور سرمایہ داروں میں پایا جاتا ہے۔ جدید سوشلزم اپنی نظریاتی بناوٹ میں اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی فلسفیوں کے خیالات کی ارتقائی صورت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید سوشلزم کی جڑیں مادی اور معاشی اسباب میں چھپی ہوئی ہیں لیکن ہر نئے نظریئے کی طرح سوشلزم بھی ابتدا میں ذہنی مواد کے احاطے سے متعلق رہا ہے۔

فرانس کے اُن بڑے آدمیوں نے، جو لوگوں کے ذہن کو آنے والے انقلاب کے لئے تیار کر رہے تھے، خود بھی انتہائی درجہ انقلابی رویئے اختیار کئے رکھے۔ وہ کسی قسم کی خارجی قُوت کے قائل نہیں تھے۔ مذہب، مظاہرِ قدرت کے تصوّرات، سوسائٹی، سیاسی نظام، غرض یہ کہ ہر چیز ان کی بے رحمانہ تنقید کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ ان کے نزدیک ہر چیز کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی ہستی کو عقل کی میزان میں ثابت کرے یا اپنی ہستی کے تمام دُعاوی سے دست بردار ہو جائے۔ ہر چیز کو دلیل کے پیمانے میں ناپا جانے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہیگل کے خیال میں دنیا اپنے سر کے بل کھڑی تھی۔ ابتدا میں اس سے یہ مراد تھی کہ انسانی ذہن اور اس کے غور وفکر سے پیدا شدہ اصول ہی انسان کے تمام افعال اور حرکات کی بنیاد ہیں۔ لیکن آگے چل کر ان الفاظ کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی اور اس سے یہ سمجھا جانے لگا کہ اگر کوئی حقیقت ان اصولوں کی ضد ہو تو اسے اسے اُلٹ پلٹ کر ان کے مطابق بنا دینا چاہیے۔ چناچہ سوسائٹی اور حکومت کی تمام پچھلی صورتوں اور روایات پر مبنی پرانے خیالات کو نامعقول کہہ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا۔ ان کے نزدیک اس وقت تک دنیا تعصّبات کی تقلید کرتی رہی تھی۔ اس لئے ماضی کی ہر چیز افسوس اور نفرت کی مستحق تھی۔ پہلی مرتبہ صبح نمودار ہوئی، عقل کا آفتاب روشنی لئے ہوئے ظاہر ہوا۔ آئندہ تو ہمات بے انصافی، مراعات اور دباؤ کی جگہ ابدی سچائی، ابدی انصاف کے اصولوں پر مبنی مساوات اور انسان کے کبھی جدا نہ ہونے والے حقوق کا دَور دورہ ہو گا۔

آج ہم اس بات کو جانتے ہیں کہ عقل کی یہ بادشاہت سرمایہ داروں کی بادشاہت سے زیادہ نہیں تھی جسے انہوں نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا تھا۔ ابدی انصاف سرمایہ داروں کے انصاف کی صورت میں ظاہر ہوا، مساوات کا تصّور قانون کے سامنے مساوات کے سرمایہ دارانہ تصّور سے آگے نہ بڑھ سکا۔ سرمایہ داروں کی ملکیت کو انسانی

حقوق کی بنیاد قرار دیا گیا۔ عقل کی بادشاہت اور رُوسو کے معاہدۂ عمرانی کا ظہور صرف سرمایہ داروں کی جمہوریت کی صورت میں ہوا۔ اپنے سے پہلے گزرے ہوئے مفکر بھی اپنے عہد کی حدود پار نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن جاگیردارانہ امارت اور سرمایہ داروں کے نزاع کے ساتھ ساتھ لُوٹنے والوں اور لٹنے والوں -- کاہل امیروں اور محنت کش غریبوں میں بھی باہمی نزاع جاری تھی۔ اِن حالات نے سرمایہ داروں کے نمائندوں کو کسی خاص طبقے کی نمائندگی کی جگہ دُکھ کی ماری ہوئی ساری نوع انسانی کا نمائندہ بنا دیا۔ اس سے بھی زیادہ سرمایہ داروں کی جماعت کو اپنے آغاز ہی سے اپنی ضد کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ سرمایہ دار بغیر اجرتی مزدوروں کے اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتے۔ طرح ازمنۂ وسطیٰ کے گِلڈ کا تاجر موجودہ سرمایہ دار کی صورت اختیار کر گیا اسی طرح گلڈ میں اور اس سے اُجرت پر کام کرنے والے کاریگر آہستہ آہستہ پرولتاریہ میں بدل گئے۔ اگرچہ سرمایہ دار جاگیرداروں سے ٹکّر لیتے وقت یہ دعویٰ کر سکتے تھے کہ وہ اس زمانے کے مزدوروں کے مختلف گروہوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی سرمایہ داروں کی ہر بڑی تحریک میں اس جماعت کی طرف سے آزادانہ ہنگامے ہوتے رہے جو موجودہ پرولتاریہ کی پیش رو تھی۔ مثال کے طور پر جرمنی میں تحریکِ اصلاح اور کسانوں کی جنگ کے زمانہ میں تھامس منزر کی تحریک، انگلستان کے انقلاب کے زمانے میں لیولر کی تحریک اور انقلاب فرانس میں بابوف کی تحریک۔

اس طبقہ کی جس نے ابھی تک پوری نشو ونما نہیں پائی تھی۔ مسلّح شورشوں کے ساتھ ساتھ اس جماعت کے متعلق نظریاتی اثرات بھی ظاہر ہونے لگے۔ چنانچہ سولھویں اور سترہویں صدی میں ایک مثالی مُعاشرت کے خیالی خاکے تیار کئے گئے۔ اٹھارھویں صدی میں موریلی اور میبلی نے کمیونسٹ سوسائٹی کے نظریئے مرتب کئے۔ اب مساوات کا مطالبہ صرف سیاسی حقوق تک محدود نہ رہا بلکہ اسے افراد کے مجلسی حالات پر بھی پھیلا دیا گیا۔ طبقاتی مراعات کے مٹا دیئے جانے کے ساتھ ساتھ طبقاتی امتیازات کی تنسیخ کا بھی مطالبہ ہونے لگا۔ نئی تعلیمات کا اظہار ایک ایسے راہبانہ کمیونزم کی صورت میں ہوا جو زندگی کی تمام مسّرتوں سے منہ موڑے ہوئے، انسانی زندگی کو اسپارٹی رنگ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تین خیالی سوشلسٹوں کا دور آیا۔ سین سمیون جس پر مزدوروں کے اثر کے ساتھ ساتھ بورژوائی اثرات بھی غالب تھے۔ فوریئے اور اودین باقی ماندہ دو خیالی سوشلسٹ ہیں۔ اودین نے اس ملک میں جہاں سرمایہ دارانہ پیداوار سب سے زیادہ ترقی پر تھی۔ طبقاتی امتیازات مٹانے کے لئے ایسی تجویزیں مرتب کیں جن کا براہ راست تعلق فرانسیسی مادیت سے تھا۔

ان تینوں میں یہ بات سانجھی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی مزدوروں کے مفاد کی نمائندگی کے لیے آگے نہیں بڑھا جو (مزدور طبقہ) اس اثنا میں تاریخ نے پیدا کر دیا تھا۔ فرانسیسی فلسفیوں کی طرح وُہ سب سے پہلے کسی خاص طبقہ کو

آزادی نہیں دلاتے بلکہ وُہ ساری نوعِ انسانی کی آزادی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ان فلسفیوں کی طرح وہ بھی عقل اور ابدی عدل کی بادشاہت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن ان تینوں خیالی سوشلسٹوں اور فرانسیسی فلسفیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ان تینوں کی نظر میں بو رژوائی دنیا بھی، انکے اصولوں کی بنیاد پر، نامعقول اور غیر مُنصف ہے اور اسی وجہ سے وُہ جاگیرداری اور اس کے پہلے کے سوشل نظاموں کی طرح اس نئے نظام کو بھی ٹھکرادینا چاہتے ہیں۔اگر اس وقت تک خاص خالص عقل اور عدل کی حکومت قائم نہیں ہوسکی تو اس کی صرف یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے اب تک ان کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا۔انکے نزدیک ایک ایسے بلند خیال مفکّر کی ضرورت تھی جواب پیدا ہو چکا ہے اور جو سچائی کو سمجھتا ہے۔کہ ایسا مفکر اب پیدا ہو چکا ہے اور یہ کہ یہ کوئی ناگزیر واقعہ نہیں ہے، نہ ہی تاریخی ارتقا کا تلازمہ ہے، بلکہ ایک خوشگوار حادثہ ہے۔ان کے خیال کے مطابق ایسی ہستی پانسو سال پہلے پیدا ہوکر نوع انسانی کو پانسو سال کی لغزشوں، کش مکشوں اور مصیبتوں سے بچا سکتی تھی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی فلسفیوں نے انقلاب کے لئے راستہ تیار کیا اور موجودات کے لئے صرف عقل کو پرکھیا بنانے کی اپیل کی۔وُہ ایک عقلی ریاست اور ایک عقلی سوسائٹی بنانے کے بعد ہر اُس چیز کو، جو اَبدی عقلیت کے منافی ہوتی، ختم کردینا چاہتے تھے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ یہ ابدی عقلیت حقیقت میں اُس درمیانے طبقے کی مثالی فراست کے سوا کچھ نہیں تھی جو آہستہ آہستہ سرمایہ داروں کا روپ اختیار کر رہا تھا۔جب انقلابِ فرانس نے اس عقلی سوسائٹی اور عقلی ریاست کو حاصل کرلیا تو یہ بات ظاہر ہوئی کہ وُہ نئے ادارے جو پہلے سے زیادہ عقلی تھے۔وُہ کسی حالات میں بھی مکمّل طور پر عقلی نہیں تھے۔'عقلی ریاست' کی یہ کشتی پاش پاش ہوگئی۔روسو کا معاہدہ عمرانی عہدِ خطر کی صورت میں ظاہر ہوا۔بہت جلد سرمایہ داروں نے، جنہیں اپنی سیاسی صلاحیت پر بھروسہ نہیں رہا تھا، پہلے نظامت کی بدعنوانیوں میں پناہ لی اور پھر نپولین کے استبداد کے سایہ تلے چلی گئی۔موعودہ ابدی امن، ایک نہ ختم ہونے والی فتوحات کی جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا۔عقلی سوسائٹی کا انجام بھی کچھ بہتر نہیں تھا۔امیر اور غریب کا تضادِ گلڈ اور دوسرے اداروں کے مٹ جانے اور کلیسیا کے خیراتی اداروں کے بند ہوجانے سے زیادہ تیز ہوگیا۔ملکیت کی آزادی کا حق اس سے آگے نہ بڑھ سکا کہ چھوٹے سرمایہ دار اور چھوٹے کاشتکار اپنی ملکیت کو بڑے سرمایہ داروں اور بڑے زمینداروں کے ہاتھ فروخت کرسکیں۔ جہاں تک چھوٹے کاشتکاروں کا تعلق تھا، ان کے لئے یہ آزادی اپنی اپنی ملکیت سے آزادی بن گئی۔سرمایہ دارانہ اُصول پر صنعتی ترقی نے محنت کرنے والے طبقوں کے افلاس اور دُکھ کو اِس حد تک بڑھادیا کہ وہ سماج کے وجود کا ایک لازمی سبب بن گئے۔ کارلائل کے الفاظ میں ''انسانوں کے باہمی تعلقات کا انحصار نقد ادائیگی پر تھا''۔ جرائم کی فہرست میں ہر سال

اضافہ ہونے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جاگیردارانہ دور کی برائیاں، جو پہلے دِن دیہاڑے ہُوا کرتی تھیں، وہ کُلی طور پر ختم تو نہیں ہوئی تھیں۔ لیکن پھر بھی انہیں عارضی طور پر جبراً نظروں سے اوجھل ہونا پڑا تھا۔ لیکن سرمایہ دارانہ بُرائیاں جو پہلے چھُپ چھُپ کر ہوتی تھیں اب سرِ بازار ہونے لگیں۔ کاروبار میں آہستہ آہستہ دغابازی پیدا ہوتی چلی گئی۔ انقلاب پسندوں کا نعرۂ اخوت عیارانہ سوفسطائیت اور حریفانہ کش مکش کی رقابت میں ظاہر ہوا۔ ظلم وستم کی جگہ بدعنوانی نے لے لی۔ مجلسی اقتدار کے حصول کے لئے تلوار کی جگہ دولت نے سنبھالی۔ پہلی رات کا حق جاگیرداروں کے ہاتھ سے نکل کر سرمایہ داروں کے تصرف میں آ گیا۔ بیسیواپن میں نمایاں اضافہ ہوا۔ پہلے کی طرح شادی آئینی صورت میں تو رہی۔ لیکن اسے بیسواپن کے لئے ایک پردہ بنا دیا گیا۔ زنا کاری بھی ساتھ ساتھ بڑھنے لگی۔

روشن خیالی کے علم برداروں کے جوشیلے وعدوں کے مقابلے پر عقلیت کی فتح نے جو مجلسی اور سیاسی ادارے قائم کئے تھے وہ محض ازالہ اوہام کے خاکے ثابت ہوئے۔ اب صرف اس بات کی کمی تھی کہ چند لوگ اس ازالہ اوہام کی آواز بلند کرتے چنانچہ نئی صدی کے شروع ہوتے ہی یہ لوگ آ گئے۔ 1802 میں سین سیمون کی کتاب ''مکتوبِ جنیوا'' شائع ہوئی۔ فوریئے نے اگرچہ اپنے نظریہ کی بنیاد 1799 میں رکھی تھی۔ لیکن اس کی پہلی کتاب 1809 میں چھپی۔ جنوری 1800 کی پہلی تاریخ کو رابرٹ اووین نے نیولنارک کے نظم ونسق کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اُس زمانہ میں سرمایہ دارانہ طریق پیداوار اور اس کے ساتھ ہی سرمایہ داروں اور مزدورں کے باہمی نزاع نے کوئی نمایاں صورت اختیار نہیں کی تھی۔ جس صنعت کا بڑے پیمانے پر انگلستان میں آغاز ہو چکا تھا، وُہ صنعت فرانس میں موجود نہیں تھی۔ بڑے پیمانے کی یہی صنعت ایک طرف تو ایسے تضاد کی نشو نما کرتی ہے جو ذریعہ پیداوار میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اور جو ذریعہ پیداوار کی سرمایہ دارانہ ہیئت کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ اختتام ایک فوری ضرورت بن جاتا ہے۔ یہ تضاد نہ صرف ان طبقوں میں پیدا ہوتا ہے جنہیں بڑی صنعت پیدا کرتی ہے بلکہ ان پیدا آور قوتوں اور تبادلے کی صورتوں میں بھی تضاد پیدا ہو جاتا ہے جنہیں بڑی صنعت پیدا کرتی ہے۔ دوسری طرف یہ بڑی صنعت ان بڑی بڑی پیدا آور قوتوں کے تضاد کو مٹانے کے اسباب بھی پیدا کر دیتی ہے۔ 1800 میں نئے مجلسی نظام کے تضاد نے ابھرنا شروع کیا تھا۔ اس تضاد کو حل کرنے والے اسباب ایک دم کیونکر ہو سکتے تھے۔ اگرچہ عہدِ خطر میں پیرس کے بھوکے ننگوں نے تھوڑی دیر کے لئے سرمایہ داروں کی مرضی کے خلاف سرمایہ داروں کے انقلاب کو کامیاب بنا کر حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایسے کرنے سے انہوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان حالات میں وُہ زیادہ دیر تک اپنی حکومت قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ مزدور طبقہ، جو اس زمانہ میں بھوکے ننگے عوام سے علیحدہ ہو کر ایک نئے طبقے کی صورت اختیار کر رہا تھا، اتنی صلاحیت نہیں رکھتا تھا کہ وُہ آزادانہ طور سے کوئی سیاسی کام کر سکتا۔ مزدور

طبقہ تو ابھی مُصیبت زدہ تھا جو اپنی مدد آپ نہیں کر سکتا تھا اور جسے صرف باہر سے یا اوپر کے طبقے سے مدد مل سکتی تھی۔

اس تاریخی حقیقت نے سوشلزم کے بانیوں پر بھی غلبہ پا لیا تھا۔ خام سرمایہ دارانہ ذریعہ پیداوار اور خام طبقاتی احساس نے خام نظریئے پیدا کر دیئے۔ مجلسی مسائل کا وہ حل جو ابھی تک غیر ترقی یافتہ معاشی اسباب میں چھپا ہوا تھا۔ اسے سوشلزم کے ان بانیوں نے خام انداز میں پیش کر دیا۔ سوسائٹی خرابیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ان خرابیوں کو دور کرنا غور و فکر کے ذُمہ تھا۔ اس بات کی سب سے زیادہ ضرورت تھی کہ کسی نئے اور مکمل مجلسی نظام کو تلاش کیا جاتا اور پھر باہر سے اس کا امکان ہوتا وہاں چند تجربوں کو نمونہ بنا کر پیش کیا جاتا۔ یہ نئے نئے مجلسی نظام شروع ہی سے خیالی خاکوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان خاکوں میں جتنی زیادہ رنگ آمیزی کی جاتی وُہ اتنے ہی زیادہ پھیکے ہوتے چلے جاتے۔

اس امر کے تسلیم کئے جانے کے بعد اب ہم ایک لمحہ کے لئے اس مسئلہ پر، جس کا سارا تعلق ماضی سے ہے، غور نہیں کرنا چاہتے۔ ہم اس مسئلہ کو اُن ادبی مفسروں پر چھوڑتے ہیں جو ان خیالی خاکوں کے متعلق ذہنی برتری کا ثبوت دینا چاہیں۔ اس کے برعکس ہم ان خیالات پر بحث کریں گے جو ان خیالی خاکوں کی پردہ پوشی کے ضمن میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور جن سے یہ کم نظر لوگ واقف نہیں ہیں۔ سین سیمون فرانس کے بڑے انقلاب کا فرزند تھا۔ انقلاب کے وقت وُہ تیس سال سے بھی کم تھا۔ اس انقلاب میں تیسرے طبقہ کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ تیسرے طبقے سے مراد فرانسیسی قوم کے وُہ عوام ہیں جو تجارت اور پیداوار میں کام کرتے۔ اس انقلاب میں مراعاتی طبقوں، نوابوں اور پادریوں کو شکست ہوئی تھی۔ لیکن تیسرے طبقے کی یہ فتح بہت جلد اسی طبقے کے ایک چھوٹے سے حصے کی فتح بن گئی۔ تمام سیاسی قوت پر املاک رکھنے والوں کا تسلط ہو گیا تھا۔ سرمایہ داروں کے اس طبقے نے نوابوں اور کلیسیا کی ضبط شدہ جائیدادوں پر سٹہ کھیل کر اور فوجی ٹھیکوں کے نام پر قوم سے دھوکا کر کے بہت زیادہ دولت کمائی تھی۔ ان اُچکوں کی بدولت نظامت کے عہد میں فرانس تباہی کے کناروں تک پہنچ گیا اس طرح نپولین کو موقع مل گیا کہ وُہ فوجی ہلہ بول کر اقتدار حاصل کر لے۔

یہی وجہ کہ سین سیمون کے خیال میں تیسرے طبقے اور مراعاتی طبقوں کی نزاع نے ورکروں اور کاہلوں کی نزاع کی شکل اختیار کر لی۔ کاہلوں میں صرف مراعاتی طبقے ہی شامل نہیں تھے۔ بلکہ وُہ تمام طبقے جو پیداوار اور تقسیم میں حصہ لئے بغیر بن کمائی دولت پر زندہ تھے۔ سین سیمون کے ورکروں میں صرف اجرتی مزدور ہی شامل نہیں ہیں بلکہ کارخانہ دار تاجر اور ساہوکار بھی شامل ہیں۔ انقلاب نے اس بات کو ثابت کر دیا تھا کہ کاہلوں میں ذہنی رہنمائی اور سیاسی اقتدار کی صلاحیت موجود نہیں تھی۔ سین سیمون کا یہ بھی خیال تھا کہ عہدِ خطر کے تجربوں نے ثابت کر دیا تھا کہ ملکیت نہ رکھنے والے طبقوں میں بھی اس قسم کی صلاحیت نہیں تھی۔ ان حالات میں کون رہنمائی کرتا؟ کون سالار

بنتا؟ سین سیمون کے نزدیک سائنس اور انڈسٹری دونوں کو ایک نئے مذہبی رشتے میں جوڑ کر مذہبی خیالات کے اس اتحاد کو پیدا کیا جا سکتا تھا جو اصلاح کے زمانہ سے ناپید ہو چکا تھا: جدید عیسائیت کی صوفیانہ تاویل اور کٹڑ طریقہ سے درجہ بندی پر مبنی مسیحیت۔ لیکن سائنس عبارت تھی علما سے، اور انڈسٹری مشتمل تھی محنت کرنے والے سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں پر۔ سینٹ سائمن کی خواہش تھی کہ یہ سرمایہ دار اپنے آپ کو پبلک کے عہدہ دار اور مجلسی امین خیال کریں۔ اِن سرمایہ داروں کو وہ حاکمانہ اختیارات اور معاشی مراعات دینا چاہتا تھا۔ وُہ ساہوکاروں کو قرضوں کی تنظیم کرنے کے بعد سوسائٹی کی ساری پیداوار کو ان کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسکے باوجود وہ مزدوروں کے مقابلہ میں مراعات یافتہ ہی رہتے۔ یہ تصور اس وقت کے مطابق تھا۔ جبکہ فرانس میں جدید انڈسٹری ہی کی طرح مزدوروں اور سرمایہ کاروں کی نزاع آہستہ آہستہ اُبھر رہی تھی۔ لیکن سین سیمون سب سے پہلے جس چیز سے دلچسپی رکھتا ہے۔ وُہ اس طبقے کی تقدیر ہے جو تعداد اور افلاس میں سب سے زیادہ ہے۔

سین سیمون نے اپنی کتاب ''مکتوبات جنیوا'' میں اس اصول کی بنیاد رکھ دی تھی کہ ہر شخص کو کام کرنا چاہیے۔ جب وہ ان مکتوبات کو لکھ رہا تھا تو اُسے اِس بات کا علم تھا کہ عہدِ خطر دراصل کنگال عوام کا عہدِ حکومت تھا۔ وہ ان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ دیکھو! جب فرانس پر تمھارے ساتھیوں کی حکومت تھی تو اس وقت فرانس پر کیا گزری۔ انہوں نے ملک میں کال پیدا کر دیا۔ لیکن 1802 میں انقلابِ فرانس کو نہ صرف جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی طبقاتی لڑائی کہنا بلکہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں اور کنگالوں کی طبقاتی لڑائی کہنا کسی بہت بڑی ذہانت ہی کا انکشاف ہو سکتا تھا۔ 1816 میں اس نے اس بات کا اعلان کیا کہ سیاست نام ہے پیداوار کی سائنس کا۔ اس نے یہ پیش گوئی کی کہ سیاست معاشیات میں گم ہو کر رہ جائے گی۔ اگرچہ یہی خیال، کہ معاشی حالات ہی سیاسی اداروں کی بنیاد ہیں، ایک ناقص صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ پھر بھی اس سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ لوگوں پر حکومت کرنے کی جگہ سیاسی حکومت کا کام اشیاء کے نظم و نسق اور ذرائع پیداوار کی رہنمائی کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ یعنی ریاست کی تنسیخ کی طرف جس کے متعلق حال ہی میں بہت زیادہ شور مچایا جا چکا ہے۔

اپنے ہم عصروں پر اس کی برتری کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ 1814 میں اتحادی فوجوں کے پیرس میں داخل ہونے سے تھوڑی دیر بعد اور پھر 1815 میں جنگِ صد سالہ میں اُس نے کہا تھا کہ فرانس کو انگلستان کے ساتھ دوستی کر کے ان دونوں ملکوں کو جرمنی کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرنا چاہئے کیونکہ اس صورت میں یورپ میں امن اور خوشحالی قائم رہ سکتی ہے۔ 1815 میں فرانسیسیوں سے یہ کہنا کہ وہ واٹر لو میں جیت جانے والوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کریں، یقینی طور پر بلند ہمتی اور تاریخی دور اندیشی پر مبنی تھا۔

اگر سین سیمون میں ہم وسعت نظری پاتے ہیں اور اس کے بعد آنے والے سوشلسٹوں کو ان خیالات کی

پیروی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جو خالص معاشی نہیں ہیں اور جنہیں وہ اپنی کتابوں میں ناقص طریق پر پیش کرتا ہے۔ تو فوریئے کو ہم مروجہ مجلسی حالات کا نقاد پاتے ہیں۔ اس کی تنقید خالص فرانسیسی مزاح کے باوجود ذکاوت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ فوریئے سرمایہ داروں کو ان کے اپنے دعاوی کی میزان میں پرکھتا ہے۔ وہ انقلاب سے پہلے کے سرمایہ داروں کے جوشیلے پیامبروں اور ان کے چاپلوسوں کو، جو انقلاب کے بعد آئے، اس میزان میں پرکھتا ہے۔ فوریئے نہایت بے رحمانہ انداز میں سرمایہ دارانہ دنیا کے مادی افلاس کو بے نقاب کرتا ہوا روشن خیالی دور کے ابتدائی فلسفیوں کے وعدوں سے اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ روشن خیالی کے اُس دور کے فلسفیوں نے ایک سوسائٹی کا نقشہ کھینچا تھا، جہاں عقل کی حکومت ہوگی۔ ایک ایسی تہذیب پیش کی تھی جو عالمگیر مسرتوں کی حامل ہوگی اور جس میں انسان اپنے کمالات کا غیر محدود طور پر مظاہرہ کر سکے گا۔ فوریئے نے اپنے عہد کے سرمایہ دار عینیت پسندوں کی خوش نما لفاظی پر بھی ضرب لگائی۔ اس کا تلخ طنزیہ انداز لفاظی کی اس مایوس کن ٹائیں ٹائیں فش پر غالب آ جاتا ہے۔

فوریئے صرف ایک نقاد ہی نہیں بلکہ اس کی نہ دبنے والی شگفتہ مزاجی اسے ایک طنز نگار بھی بنا دیتی ہے۔ وہ بلا شبہ دنیا کے بہت بڑے طنز نگاروں میں سے ایک ہے۔ انقلاب فرانس کے زوال کے بعد سٹے، دھوکے، سوداگروں کی دکاندار ذہنیت کا جو عام رواج ہو گیا تھا اسے وہ دلچسپ مگر استادانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ جب وہ سرمایہ دارانہ سوسائٹی کے جنسی تعلقات اور اس سوسائٹی میں عورت کی پوزیشن کی وضاحت کرتا ہے تو وہ اپنے انداز نگارش کے عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ اس نے سب سے پہلے اس بات کا اعلان کیا کہ کسی سوسائٹی کی عمومی آزادی کا اندازہ اس آزادی سے لگایا جا سکتا ہے، جو وہاں کی عورتوں کو نصیب ہو۔ جب وہ سوسائٹی کی تاریخ کا تصور پیش کرتا ہے تو اپنی عظمت کی بلندیوں پر دکھائی دیتا ہے۔ وہ سوسائٹی کے ماضی کے ارتقاء کو وحشت، بربریت، سرقبیل اور تہذیب کے ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔ آخری دور وہی ہے۔ جو آج کل سرمایہ دارانہ دور کہلاتا ہے اور جس کا آغاز سولہویں صدی میں ہوا۔ فوریئے کہتا ہے کہ تہذیب کا دور ہر اس برائی کو، جو بربریت کے دور میں اپنی سادہ صورت میں تھی، مبہم، پیچیدہ اور منافقانہ بنا دیتا ہے۔ تہذیب برائی کے چکر میں حرکت کرتی ہوئی اپنے تضاد کو پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ اس تضاد پر غلبہ نہیں پا سکتی یہی وجہ ہے کہ وہ اس مقام پر نہیں پہنچتی جہاں پہنچنے کا وہ دعویٰ کرتی ہے۔ بلکہ وہ اس مقام پر پہنچتی ہے جو اس کے بتائے ہوئے مقام کی ضد ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تہذیب کے دور میں افراط سے افلاس پیدا ہوتا ہے۔ فوریئے جدلیات کے استعمال میں اپنے ہم عصر ہیگل سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ وہ جدلیات ہی کے بل بوتے پر غیر محدود انسانی تکمیل کے تصور کی مخالفت کرتا ہوا یہ دعویٰ پیش کرتا ہے کہ ہر تاریخی دور کا عہدِ عروج اور عہدِ زوال ہوتا ہے۔ وہ اپنے اسی تصور کو ساری نوع انسانی پر منطبق کرتا ہے۔ جس طرح کانٹ نے نیچرل سائینس میں زمین کی مکمل تباہی کا تصور پیش کیا اسی طرح فوریئے نے علم تاریخ میں نوع انسانی کی مکمل تباہی

کا تصور پیش کیا۔ جب فرانس میں انقلاب کی آندھی چل رہی تھی تو اس وقت انگلستان میں ایک خاموش مگر اہم انقلابی عمل ترقی پذیر تھا۔ بھاپ اور اوزار بنانے کی نئی مشینری صنعت کو بڑے پیمانے کی جدید صنعت میں ڈھال رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مہاجنی سوسائٹی میں بھی انقلابی عمل جاری ہو چکا تھا۔ مصنوعات تیار کئے جانے کی سست رفتاری ایک ایسے دور میں داخل ہو چکی تھی جس نے پیداوار میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ سوسائٹی مہاجنوں اور کنگال مزدوروں میں نمایاں طور پر بٹنے لگی۔ ان دو طبقوں کے درمیان پہلے کے سے مضبوط درمیانے طبقے کی جگہ اب دستکاروں اور چھوٹے چھوٹے دکانداروں پر مشتمل ایک کمزور طبقے نے لے لی۔ اس طبقے کی حالت بہت زیادہ نازک تھی۔ ساری آبادی میں سے اس طبقے کی تعداد سب سے زیادہ گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ نیا ذریعۂ پیداوار اپنے خطِ عروج کے موڑ تک مشکل سے پہنچا تھا۔ یہ نیا ذریعۂ پیداوار ان حالات میں نارمل تھا، لیکن اس زمانے میں بھی یہ شدید خرابیاں پیدا کر رہا تھا۔ بے گھر لوگوں کو چوپاؤں کی طرح ایک ساتھ رہنا پڑتا تھا۔ یہ لوگ بڑے شہروں کے بدترین حصوں میں رہتے۔ ماں باپ اور دوسرے خاندانی رشتے ٹوٹنے لگے۔ گھریلو روایات ختم ہو گئیں۔ عورتوں اور بچوں سے بہت زیادہ کام لیا جانے لگا۔ مزدوروں کا وہ طبقہ جس، ے دیہات سے شہروں اور زراعت سے صنعت کی طرف لایا گیا تھا، نئے ماحول میں پھینک دیا گیا جس سے اس طبقے کی اخلاقی حالت بگڑ گئی۔ اس طبقے کو اپنے پہلے ماحول (زرعی) سے، جہاں ایک حد تک پائیداری تھی، نکال کر ایک ناپائیدار اور ہمیشہ بدلنے والے ماحول میں ٹھونس دیا گیا۔ اس موقعہ پر 29 برس کا ایک نوجوان کارخانہ دار ایک ریفارمر کی حیثیت سے ظاہر ہوا اس شخص کے کردار میں بچوں کی سی سادگی تھی۔ وہ فطرتاً ایک ایسا لیڈر تھا جو کبھی کبھی پیدا ہوتا ہے۔ اس کا نام رابرٹ اووینے۔ اس نے فرانس کے مادہ پرست فلسفیوں کے ان خیالات کو اپنا لیا تھا کہ انسانی کردار موروثی ہیئت اور ماحول کی پیداوار ہے۔ خصوصاً اُس ماحول کی جس میں انسان نے ابتدائی نشو ونما پائی ہو۔ جب صنعتی انقلاب ہوا تو اووین کے طبقے کے بہت سے لوگ انتشار اور ابتری کے سوا اور کچھ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ لوگ ان حالات سیفائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنا چاہتے تھے۔ لیکن اووین نے اس موقعہ پر اپنے محبوب نظریئے کو عمل میں لانا چاہا۔ وہ انتشار کو انتظام میں بدل دینا چاہتا تھا۔ جب وہ مانچسٹر کے ایک کارخانے میں پانسو مزدوروں کا داروغہ تھا تو اسے اپنے تجربے میں کامیابی ہوئی تھی۔ 1800 سے 1829 تک سکاٹ لینڈ کے ایک مقام نیولنارک میں وہ روئی کاتنے کے ایک کارخانے کا حصہ دار تھا۔ اس مدت میں اس نے اپنے تجربات کو آزادی سے آزمایا۔ اس کی کامیابی نے اسے یورپ بھر میں مشہور کر دیا تھا۔ اس کارخانے کی آبادی بڑھتے بڑھتے اڑھائی ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ شروع شروع میں اس کارخانے میں کام کرنے کے لئے جو مزدور آئے تھے ان میں سے اکثر کی اخلاقی حالت گری ہوئی تھی۔ لیکن اووین نے ان بگڑے اخلاق والوں کو سنوار کر ان کی بستی کو ایک

نمونہ بنادیا۔اس بستی میں شراب نوشی، پولیس، مجسٹریٹ،مقدمہ بازی، قانون، مساکین کے اداروں اور خیرات کی ضرورت کا نام ونشان تک بھی نہیں تھا۔اس نے نہایت سادگی سے لوگوں کیلئے انسانوں کے شایان شان زندگی بسر کرنے کے مواقع پیدا کئے۔اس نے اس نوآبادی کی نئی نسل کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی۔بچوں کے اسکول کا بھی وہی بانی ہے۔دوسال کے بچوں کو اس اسکول میں بھیج دیا جاتا تھا۔اس اسکول میں ان چھوٹے بچوں کی دلچسپی کے اتنے سامان ہوتے تھے کہ بچے وہاں سے گھر جانے کا نام تک نہیں لیتے تھے۔دوسرے کارخانوں میں مزدوروں کو تیرہ چودہ گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑتا تھا۔جب کپاس کی منڈی میں بحران پیدا ہوا تو کارخانے کو چار مہینوں کے لئے بند کرنا ضروری ہوگیا۔لیکن اس کے باوجود نیولنارک کے مزدوروں کو پوری اجرت ملتی رہی۔اس پر بھی کاروبار دگنا ہوگیا اور کارخانے کے مالکوں کو بہت زیادہ منافع حاصل ہوا۔

ان سب باتوں کے باوجود اووین مطمئن نہیں تھا۔اس نے مزدوروں کو جو آسانیاں دے رکھی تھیں، اس کے نزدیک وہ انسان کے شایان شان زندگی بسر کرنے کے لئے ناکافی تھیں۔وہ کہتا ہے کہ ''یہ لوگ میرے غلام ہیں!''۔اس نے مزدوروں ک واسطے نسبتاً بہتر حالات پیدا کردیئے تھے۔لیکن ان حالات میں مزدوروں کی ذہنی اور کرداری ترقی نہیں ہورہی تھی۔انہیں آزاد زندگی بھی نصیب نہیں تھی لیکن اس بھی ڈھائی ہزار مزدوروں کی روزانہ محنت سوسائٹی کے لئے اتنی دولت پیدا کررہی تھی جتنی کہ پچاس سال پہلے چھ لاکھ مزدوروں سے پیدا ہوتی تھی۔میں نے اپنے آپ سے پوچھا: ڈھائی ہزار اور چھ لاکھ انسانوں کی خرچ کرنے والی دولت کا فرق کہاں چلا گیا؟ جواب واضح تھا۔اس فرق میں سے کارخانے کے مالکوں کو ان کے لگائے ہوئے سرمایہ پر پانچ فیصدی سود دیا گیا۔سود کے علاوہ تین لاکھ پونڈ منافع بھی تقسیم کیا گیا۔جو کچھ نیولنارک کے کارخانے کی حالت تھی وہی کچھ انگلستان کے دوسرے کارخانوں کی حالت تھی۔

> ''اگر مشینری کے ذریعہ یہ نئی دولت پیدا نہ کی جاتی۔تو نپولین کا تختہ الٹنے اور سوسائٹی کے اشرافیہ اصولوں کی بقا کے لئے جو لڑائیاں لڑی گئی تھیں ان میں کامیابی محال تھی۔یہ نئی قوت مزدوروں ہی کی پیدا کی ہوئی تھی۔''

> (''ذہن اور عمل میں انقلاب'' ایک یادداشت جو اووین نے 1828 میں فرانس کی عارضی حکومت، ملکہ وکٹوریہ اور برطانوی وزیروں کو بھیجی تھی۔اس یادداشت میں یورپ کے جمہوریت پسندوں کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں سے خطاب کیا گیا ہے۔)

اس نئی قوت کا پھل بھی مزدوروں ہی کو ملنا چاہیے تھا۔اددین کے نزدیک یہ نئی پیدا آوری قوتیں جن سے اس وقت تک صرف چند افراد نے فائدہ اٹھایا تھا اور جنہوں نے عوام کو غلام بنالیا تھا، ایک نئی سوسائٹی کی بنیاد تھیں۔

جس میں ان نئی پیدا آوری قوتوں کی ملکیت مشترک ہو اور جس میں ہر شخص سب کی مشترک بھلائی کے لئے کام کرے۔

اووینی کمیونزم خالص کاروباری انداز میں پیدا ہوتی تھی۔ یوں کہئے کہ وہ ساہوکاری بہی کھاتے کا نتیجہ تھی۔ اس کی یہ عملی خصوصیت برابر قائم رہی۔ 1823 میں آئر لینڈ پر جو مصیبت ٹوٹ پڑی تھی۔ اسے دور کرنے کے لئے اددین نے کمیونسٹ نو آبادیوں کی جو اسکیم بنائی تھی۔ اس میں ان نو آبادیوں کے ابتدائی مصارف، سالانہ اخراجات، ان کی آمدنی کا ایک ہمہ گیر خاکہ موجود تھا۔ اددین نے مستقبل کے لئے جو پلان بنایا تھا اس میں بھی ٹیکنیکل تفصیلات کو اس صلاحیت سے ترتیب دیا تھا اور اس کے تمام پہلوؤں کی اس انداز میں وضاحت کی تھی کہ اگر ایک مرتبہ اووین کی مجلسی اصلاح کی اسکیم کو مان لیا جائے تو پھر ایک ماہر کے نکتۂ نگاہ سے تفصیلات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ کمیونزم کی طرف بڑھنے سے اووین کی زندگی میں یکسر تبدیلی پیدا ہو گئی۔ جب تک کہ وہ انسان دوست بنا رہا اس وقت تک وہ دولت، ستائش عزت اور شان حاصل کرتا رہا۔ وہ یورپ کا سب سے زیادہ مقبول انسان تھا۔ اس کی باتوں کو نہ صرف کارخانہ دار ہی سنتے تھے، بلکہ مدبر اور حکمران بھی اس کی باتوں کی تائید کرتے تھے۔ لیکن جونہی وہ کمیونسٹ نظریئے لے کر سامنے آیا تو حالات پہلے ایسے نہ رہے۔ اس کے نزدیک ذاتی ملکیت، مذہب اور شادی کا مروجہ طریقہ مجلسی اصلاح کی راہ میں تین رکاوٹیں تھیں۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کی مخالفت کا انجام کیا ہوگا۔ سرکاری حلقوں کی قانونی حمایت سے محرومی اور اپنی سوشل پوزیشن کا خاتمہ لیکن اس نے اپنے انجام سے بے پرواہ ہو کر ان رکاوٹوں کی مخالفت شروع کر دی۔ نتیجہ معلوم!! اُسے سرکاری حلقوں سے نکال دیا گیا۔ اخباروں نے اس کا نام تک لینا چھوڑ دیا۔ اس نے امریکہ میں جو کمیونسٹ تجربے کئے تھے، ان میں اس نے اپنا سب کچھ لگا دیا تھا۔ ان تجربوں کی ناکامی نے اسے قلاش کر دیا۔ اب وہ ایک مزدور تھا۔ وہ تیس سال تک مزدوروں کے ساتھ مل کر مزدوری کرتا رہا۔ انگلستان کی تمام مجلسی تحریکوں اور مزدوروں کی بھلائی سے متعلق تمام تحریکوں کا سلسلہ اووین سے جا ملتا ہے۔ پانچ سال کی کوشش کے بعد وہ مزدور عورتوں اور مزدور بچوں کے اوقات کار مقرر کرانے میں کامیاب ہوا۔ اددین ہی اس پہلی کانگرس کا صدر تھا جس میں انگلستان کی تمام مزدور سبھاؤں نے مل کر ایک ہمہ گیر مزدور سبھا قائم کی تھی۔ سوسائٹی کے پوری طرح کمیونسٹ ہو جانے تک عبوری دور کے لئے اس نے ایک طرف تو صرف کرنے والوں اور سامان پیدا کرنے والوں کے لئے باہمی امدادی سوسائٹیاں قائم کیں۔ ان سوسائٹیوں نے ایک بات تو ثابت کر دی کہ سماج کو تاجروں اور کارخانہ داروں کی ضرورت نہیں۔ دوسری طرف اووین نے مزدور بازار قائم کئے جن میں مزدوروں کی بنائی ہوئی چیزوں کے تبادلے کا ذریعہ محنتی نوٹ ہوتے تھے جن کی اکائی ایک گھنٹے کی محنت کے برابر ہوتی تھی۔ ان اداروں کی ناکامی یقینی تھی لیکن یہ ادارے بہت بعد میں آنے والے۔ پردھوں کے ایکسچینج

بنک کے پیش رو تھے ۔اووین اور پرودھوں کی تجویزوں میں یہ فرق تھا کہ اووین نے اپنی تجویزوں کو تمام مجلسی برائیوں کے لئے اکسیر نہیں بتایا تھا۔ بلکہ اس نے صرف یہ کہا تھا کہ اگر اس کی تجویزوں پر عمل کیا جائے تو سوسائٹی میں بنیادی تبدیلی کے لئے راہ نکل آئے گی ۔

ان خیالی سوشلسٹوں کا نظریہ انیسویں صدی کے سوشلسٹ تصوارات پر چھایا ہوا تھا۔ آج بھی ان تصوارات پر خیالی سوشلسٹوں کا تھوڑا بہت اثر باقی ہے۔تھوڑی مدت پہلے تک فرانس اور انگلستان کے تمام سوشلسٹ ان کے معتقد تھے ۔ابتدائی جرمن کمیونزم ویت لنگ کی کمیونزم سمیت اسی خیال سوشلزم سے متعلق تھی ۔ ان تمام خیالی سوشلسٹوں کے نزدیک سوشلزم عبارت ہے ابدی سچائی ،عقلیت اور عدل سے ۔ جونہی یہ دریافت ہوگی وہ اپنی قوت سے ساری دنیا کو خود بخود مسخر کر لے گی ۔جس طرح ابدی سچائی زمان ومکان اور انسان کے تاریخی ارتقاء سے آزاد ہے اور اس کی دریافت کب اور کہاں سے بے نیاز ایک حادثہ کی حیثیت رکھتی ہے ،اسی طرح سوشلزم بھی ایک حادثہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔لیکن اس کے باوجود خیالی سوشلزم کے مختلف اسکول ابدی سچائی ،عقلیت اور عدل کے مطالب ومعانی میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں ۔ان میں سے ہر اسکول کا بانی ابدی سچائی ، عقلیت اور عدل کو اپنی ذاتی تفہیم زندگی معلومات اور ذہنی تربیت سے وابستہ کر دیتا ہے ۔اس لئے ابدی سچائیوں کے اس اختلاف کا ایک ہی حل ممکن تھا۔ یہ کہ وہ ایک دوسرے کو پیس ڈالتے ۔اس اختلاف سے انتخابی اور اوسط درجے ہی کا سوشلزم پیدا ہوسکتا تھا ۔اس قسم کا سوشلزم فرانس اور انگلستان کے بہت سے سوشلسٹ ورکروں پر اس وقت تک چھایا ہوا ہے ۔اس قسمکے سوشلزم کے بانی وہی تنقیدی نظریئے ، وہی معاشی اصول اور انسانی مستقبل کے وہی خاکے پیش کرتے رہے ہیں جن کی مخالفت کی کم سے کم گنجائش ہو ۔اس قسم کا سوشلزم ایک ایسا آمیزہ تھا جو جتنی جلدی تیار ہوتا اتنی ہی جلدی اس کے اجزائے ترکیبی اپنا انفرادی اثر کھودیتے ۔جس طرح ندی کے بہاؤ میں کنکر اپنا نوکیلا پن کھودیتے ہیں اسی طرح اس سوشلزم نے بحث کا جو سیلاب پیدا کیا ،اس نے لوگوں کے ذہن کی دھار کو کند کر دیا ۔سوشلزم کو سائنس بنانے کے لئے ضروری تھا کہ اس کی عمارت کو کسی حقیقی بنیاد پر کھڑا کیا جاتا ۔

دوسرا باب

اسی اثنا میں اٹھارہویں صدی کے فرانسیی فلسفے کے ساتھ ساتھ اور اس کے بعد نیا جرمن فلسفہ پیدا ہو چکا تھا ۔ یہ نیا جرمن فلسفہ ہیگل پر ختم ہوا ۔اس نئے فلسفے کی سب سے بڑی خوبی ہی تھی ۔ کہ اس نے پھر جدلیات کو غور وفکر

کی انتہائی صورت تسلیم کر لیا۔ تمام قدیم یونانی فلسفی طبعاً جدلیات پسند تھے۔ ارسطوان سب میں قاموسی ذہانت رکھتا تھا۔ اس نے جدلیاتی تصور کی تمام لازمی شکلوں کا تجزیہ بھی کیا تھا۔ جدید فلسفہ میں دیکارتے اور سپائینوزا ایسے جدلیات کے شارح بھی شامل رہے ہیں لیکن یہ نیا فلسفہ برطانوی اثر کے تحت زیادہ سے زیادہ مابعدالطبیعاتی طرز استدلال اختیار کرتا چلا گیا۔ یہی طرز استدلال اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی فلسفیوں کی فلسفیانہ تحریروں پر غالب رہا۔ لیکن فلسفہ کی محدود اصطلاح سے باہر فرانسیسیوں نے جدلیات کے شاہکار پیدا کئے۔ ہم صرف دیدرو کی کتاب 'رامیو کا بھیجا' اور روسو کی کتاب 'انسانی عدم مساوات' کے آغاز پر بحث کا حوالہ کافی خیال کرتے ہیں۔ ہم ذیل میں جدلیات اور مابعدالطبیعاتی طرز استدلال کی ہیئتِ تشکیل پیش کرتے ہیں۔

جب ہم کائنات، انسانی تاریخ یا اپنی ذہنی سرگرمی پر غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمارے سامنے تعلقات اور تفاعل کے ایک نہ ختم ہونے والے گورکھ دھندے کی ایک ایسی تصویر آتی ہے جو اپنی ماہیت اور ہیئت میں ایک لمحہ کے لئے بھی ساکن اور ثابت نہیں رہتی۔ ایک تصویر جس میں کسی شے کو قرار نہیں، جہاں ہر چیز حرکت کرتی بدلتی اور وجود میں آ کر فنا ہوتی رہتی ہے۔ شروع میں ہم اس تصویر کو مجموعی حیثیت سے اس طرح دیکھتے ہیں کہ اس کی تفصیلات اوجھل رہتی ہیں۔ ہم حرکت، تبدیلی اور باہمی تعلقات کو اس شے پر ترجیح دیتے ہیں جو حرکت کرتی، تبدیل ہوتی اور باہمی تعلق قائم رکھتی ہے۔ دنیا کے متعلق ہی ابتدائی سادہ مگر بنیادی لحاظ سے تصور قدیم یونانی فلسفے کا ہے۔ سب سے پہلے اس فلسفے کو ہراکلیٹس نے مرتب کیا۔ وہ کہتا ہے کہ:

''ہر شے ہے، اور نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شے تبدیل ہوتی چلی جارہی ہے۔ ہر شے متواتر بدلتی بنتی اور بگڑتی چلی جارہی ہے۔''

یہ تصور کائنات کی تصویر کی عمومی ہیئت کی تو وضاحت کر دیتا ہے لیکن یہ تصور اُس تصویر کے اجزائے ترکیبی کی وضاحت کے لئے ناکافی ہے۔ جب تک ہم اس تصویر کے اجزائے ترکیبی سے آگاہ نہیں ہوتے اس وقت تک ہم اس تصویر کی مجموعی حیثیت کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ان تفصیلات سے واقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہم انہیں طبعی یا تاریخی تعلقات سے الگ کر کے ان میں سے ایک ایک کی ہیئت اور اسکے خصوصی اسباب و نتائج پر غور کریں۔ یہ کام طبعی سائنس اور تاریخی تحقیق کا ہے۔ طبعی سائنس اور تاریخی تحقیق سائنس کی وہ شاخیں ہیں جنہیں کلاسیکی دور کے یونانیوں نے ثانوی درجہ دے رکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علوم کی ان شاخوں (طبعی علم اور تاریخی تحقیق) پر کام کرنے کے لئے مواد جمع کرنے کی ضرورت تھی۔ کسی تنقیدی تجزیہ، تقابل، موازنہ یا طبقوں، نظاموں اور انواع کی درجہ بندی کے لئے طبعی اور تاریخی مواد مہیا کرنا بہت ضروری ہے۔ کائنات کے متعلق صحیح انداز میں تحقیق کرنے کا آغاز عہد اسکندریہ کے یونانیوں سے ہوا۔ انہوں نے اس میں ترقی کی۔ آگے چل کر ازمنہ وسطیٰ میں عربوں نے

اس میں نمایاں اضافہ کیا۔ لیکن حقیقی طبعی سائنس کا آغاز اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف سے ہوتا ہے۔ اُس وقت سے اب تک یہ ترقی کرتی چلی جارہی ہے۔ کائنات کا اِس کے انفرادی اجزا میں تجزیہ اور مختلف شکلوں کی اندرونی ترتیب کے مطالعہ نے پچھلے چار سو سال میں کائنات کے متعلق ہماری معلومات میں حیرت انگیز اضافہ کیا۔ لیکن اس اندازِ تحقیق سے ہم نے یہ بات وراثت میں پائی کہ ہم طبعی اشیا اور طبعی حرکات کو اشیا کے وسیع تعلقات سے الگ کرکے ان کے مطالعہ کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم ان اشیا کا مطالعہ اس وقت نہیں کرتے جب وہ متحرک ہوتی ہیں بلکہ اس وقت جب وہ ساکن ہوتی ہیں۔ ہم ان اشیا کا مطالعہ ان کی زندگی میں نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے مرنے کے بعد کرتے ہیں۔ جب بیکن اور لاک نے مطالعہ کے اس طریق کو طبعی سائنس سے نکال کر فلسفے میں داخل کر دیا تو اس سے پچھلی صدی کی مخصوص تنگ نظری یعنی مابعد الطبیعاتی اندازِ فکر پیدا ہوا۔ مابعد الطبیعات کے حامی کے نزدیک اشیاء اور ان کے ذہنی عکس یعنی تصورات الگ الگ چیزیں ہیں۔ جن پر الگ الگ ہی غور کیا جا سکتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ اشیا بے لوچ اور ایک ہی جگہ قائم ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس کا طرزِ استدلال ترکیب کے تسلسل کا قائل نہیں۔ عام لفظوں میں وہ یوں کہتا ہے:

''ہاں ہاں ہے اور نہیں نہیں ہے ان کے علاوہ جو کچھ اور ہے وہ سب برائی نے پیدا کیا ہے۔''

اس کے نزدیک کسی شے کا یا تو وجود ہے یا نہیں۔ وہ اس بات کو نہیں مانتا کہ کوئی چیز اپنی ذات سے الگ کوئی دوسری چیز بھی ہو سکتی ہے۔ اثبات اور نفی ایک دوسرے کی ضِد ہیں۔ اسی طرح عِلت اور معلُول ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ پہلی نظر میں یہ اندازِ فکر بہت معقول دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عام سمجھ بوجھ کا اندازِ فکر ہے۔ لیکن جب یہ تمام سمجھ بوجھ اپنی چار دیواری سے باہر نکل کر سائنسی تحقیق کے میدان میں قدم رکھتی ہے تو اسے حیرت انگیز تجربوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسی حالتوں میں جہاں متعلقہ چیزیں موضوع کی نوعیت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ وہاں مابعد الطبیعاتی اندازِ فکر مناسب اور ضروری ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود یا دیر میں اس اندازِ فکر میں ایک ایسا مقام آ جاتا ہے جہاں وہ یکطرفہ، محدود اور مبہم ہو کر کبھی حل نہ ہونے والے تضاد پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اشیا پر انفرادی طور سے غور کرنے سے مابعد الطبیعاتی اندازِ فکر اشیا کے باہم تعلقات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ ان کے وجود پر غور کرتے ہوئے وہ ان کے وجود میں آنے اور چلے جانے کو بھول جاتا ہے۔ وہ اشیا کے سکون کا تو مطالعہ کرتا ہے لیکن ان کی حرکت پر غور نہیں کرتا۔ اس طرح جزئیات پر توجہ کرنے سے مجموعی شے نظر سے چھپ جاتی ہے۔ معمولی حالات میں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں جانور زندہ ہے یا مر گیا۔ لیکن جب ہم اس مسئلہ پر زیادہ غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ایک بہت زیادہ پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اِس مسئلے کی پیچیدگی سے قانون دان اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اس مسئلہ پر کافی دماغ لڑا چکے ہیں کہ وہ کوئی ایسی معقول حد مقرر کر سکیں جبکہ ماں کے پیٹ میں بچے

کی ہلاکت کو قتل کہا جا سکے۔ موت کے لمحہ کو متعین کرنا بھی کم وبیش اتنا ہی ناممکن ہے کیونکہ عضویات کا علم ہمیں بتاتا ہے کہ موت کوئی اچانک حادثہ نہیں بلکہ وہ ایک طویل عمل کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح ہر ایک نامیاتی ہستی ہر لمحہ وہ ہستی بھی ہے اور وہ ہستی نہیں بھی ہے۔ یہ ہستی ہر لمحہ خارجی مادے کو قبول کر رہی اور داخلی مادے کو خارج کرتی چلی جا رہی ہے۔ ہر لمحہ اس ہستی کے جسم کے خلیے مرتے رہتے ہیں اور ان جگہ نئے خلیے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تھوڑی یا لمبی مدت میں اس ہستی کے جسم کا مادہ مکمل طور پر نئی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پرانے ذروں کی جگہ نئے مادی ذرے لیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ہر نامیاتی ہستی ہر وقت بجائے خود بھی ہے اور بجائے خود کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ اگر زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو کسی تضاد کے ڈانڈے اثبات اور نفی کی طرح جتنا ایک دوسرے کی ضد ہیں، اتنا ہی وہ ایک دوسرے میں ضم ہیں، اور تمام تضاد کے باوجود وہ ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ عِلت اور معلُول کی بھی یہی کیفیت ہے۔ عِلت اور معلول کو اگر کسی خالص واقعہ پر چسپاں کیا جائے تو پھر اس کا جواز ثابت ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم اس مخصوص واقعہ کو پوری دنیا کے ساتھ ملا کر اس پر غور کریں تو وہ آفاقی عمل اور باہمی عمل کے ان تصورات میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ جہاں علت اور معلول ہمیشہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں ایک لمحہ کا معلول اسی لمحہ میں علت بن جاتا ہے اور ایک لمحہ کی علت اسی لمحہ میں معلول بن جاتی ہے۔

ان میں سے کوئی انداز فکر بھی مابعد الطبیعاتی غور وفکر کے ڈھانچے میں پورا نہیں اترتا۔ جدلیات اشیا اور ان کے عکس اور تصورات پر ان کے باہمی تعلق، حرکت، تسلسل پیدائش اور موت کی روشنی میں بحث کرتی ہے۔ جدلیات کی بہت سی مثالیں اوپر دی چکی ہیں۔ فطرت جدلیات کی کسوٹی ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ جدید طبعی سائنس نے جدلیات کی تائید میں بہت سا مواد جمع کر دیا ہے اس مواد میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے۔ جدید طبعی سائنس نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ قدرت کا عمل جدلیاتی ہے نہ کہ مالبعد الطبیعاتی۔ نیز یہ کہ قدرت ایک ابدی دائرے میں چکر نہیں کاٹتی رہتی بلکہ حقیقی تاریخی ارتقا میں سے گزرتی ہے۔ اس ضمن میں کسی دوسرے سے پہلے ڈارون کا ذکر ضروری ہے۔ ڈارون نے یہ ثابت کر کے کہ، تمام نامیاتی کائنات یعنی پودے، جانور اور انسان لاکھوں سال کے ارتقا کی پیداوار ہیں، قدرت کے معلق مالبعد الطبیعاتی تصور پر ایک کاری ضرب لگائی۔ لیکن ان سائنسدانوں کی تعداد جو جدلیاتی انداز میں سوچتے ہیں بہت کم ہے۔ اس انداز میں سوچنے والوں کے درمیان بہت تفاوت ہے۔ نئی دریافتوں اور پرانے روایتی انداز فکر میں جو تصادم پایا جاتا ہے وہ اس الجھن کی وضاحت کرتا ہے جو آج کل نظری طبعی سائنس میں موجود ہے اور جس نے اساتذہ، طالب علموں، لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو مایوس کر رکھا ہے۔

کائنات اور انسان کے ارتقا اور انسانی ذہن پر اس ارتقا کے عکس کو صرف جدلیاتی انداز فکر ہی سے سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ یہی وہ انداز فکر ہے جو ہر لمحہ زندگی اور موت (ہونے اور نہ ہونے) نیز ارتقائی اور رجعتی تبدیلیوں کو ملحوظ رکھتا

ہے۔ جدید ترین جرمن فلسفے نے شروع ہی میں یہ زاویۂ نگاہ اختیار کیا۔ کانٹ نے اپنی فلسفیانہ زندگی کا آغاز نیوٹن کے نظام شمسی کی تردید سے کیا۔ نیوٹن کہتا ہے حرکتِ اولیٰ کے بعد نظام شمسی کو ابدیت حاصل ہو چکی ہے، لیکن کانٹ نظام شمسی کو ایک تاریخی تسلسل بتاتا ہے۔ اس کے نزدیک سورج اور تمام دوسرے سیارے ایک چکر کاٹتے ہوئے قدیمی مادے سے بنے ہیں۔ کانٹ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر نظام شمسی کے آغاز کا یہ دعویٰ سچا ہے تو مستقبل میں نظام شمسی کی تباہی یقینی ہے۔ پچاس سال بعد کانٹ کے خیالات کو لاپلاس نے ریاضیاتی بنیاد پر استوار کیا۔ مزید پچاس سال بعد ''طیف پیما'' نے ثابت کر دیا کہ خلا میں ایسی دہکتی ہوئی گیس کے انبار اب بھی موجود ہیں جو انجماد کے مختلف درجوں میں سے گزر رہے ہیں۔

یہ جدید ترین جرمن فلسفہ ہیگل کے سسٹم پر ختم ہوا۔ اس سسٹم میں پہلی مرتبہ ساری طبعی، تاریخی اور روحانی دنیا کو ایک تسلسل کی صورت میں پیش کیا گیا۔ یعنی وہ ایک دوامی حرکت، تغیر، قلبِ ماہیت اور ارتقا میں ہے۔ کانٹ نے یہ کوشش بھی کی کہ وہ اس حرکت اور ارتقا کے اندرونی باہمی تعلقات کو ظاہر کر سکے۔ کانٹ کے نظریئے کی یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ اس نظریہ کی رو سے انسان کی تاریخ احمقانہ، متشدد افعال کا الجھا ہوا چکر نہیں رہتی۔ جس پر پختہ فلسفیانہ عقل کے حضور میں لعنت ملامت کی جائے۔ اور جسے جلد سے جلد بھلا دینے ہی میں بہتری چھپی ہو۔ اس نظریہ نے انسانی تاریخ کو انسانیت کے ارتقا کا ایک تسلسل بنا دیا۔ اب فکر کے پیش نظر یہ کام تھا کہ وہ اس تسلسل کے تدریجی ادوار کا پتہ چلائے۔ یہ کام بھی فکر ہی کا تھا کہ وہ اس تسلسل کے اندرونی ضوابط کی کھوج نکالے جو بظاہر ایک ناگہانی مظہر دکھائی دیتا ہے۔

یہاں یہ ذکر کرنا بے سود ہے کہ ہیگل کو اس مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس نے اس نظریے کو پیش کیا۔ یہ ایک اتنا بڑا کام ہے کہ اسے کوئی ایک شخص کبھی نہیں کر سکے گا۔ اگرچہ سین سیمون کی طرح وہ اپنے زمانے کا ایک قاموسی ذہن تھا۔ لیکن اس کے لئے دو دشواریاں یہ تھیں کہ اس زمانے میں علم کی وسعت اور گہرائی بھی محدود تھی۔ ان دشواریوں کے علاوہ ایک تیسرا عنصر بھی تھا۔ ہیگل ایک عینیت پسند تھا جس کے خیال میں اس کے اپنے ذہن کے تصورات حقیقی اشیا اور عمل کے کم و بیش کوئی مجرد عکس نہیں تھے بلکہ اس کے نزدیک اشیا اور ان کا ارتقا ایک ایسے تصور کے عکس تھے۔ جو دنیا کے وجود سے پہلے ازل ہی سے کسی نہ کسی مقام پر موجود تھا۔ اس اندازِ فکر نے ہر شے کو سر کے بل کھڑا کر دیا۔ اور دنیا میں اشیا کے باہمی تعلقات کو اُلٹ دیا۔ ہیگل نے اگرچہ چند انفرادی تعلقاتِ باہمی کو صحیح طور پر اختیار کیا تھا۔ لیکن اوپر بیان کئے گئے اسباب کی بنا پر ہیگل کی بیشتر تفصیلات میں پیوند، بناوٹ اور آورد پائی جاتی ہے۔ ایک لفظ میں وہ سب کی سب غلط ہیں۔ ہیگل کا سسٹم ایک بہت بڑی نارسائی تھا۔ لیکن یہ اپنی قسم کی آخری نارسائی تھی۔ اس سسٹم کو سب سے زیادہ نقصان اس کے اندرونی تضاد

نے پہنچایا۔ اس تضاد کا کوئی حل ممکن نہیں ۔ ایک طرف تو ہیگل کا سسٹم یہ دعوی کرتا ہے کہ انسانی تاریخ ارتقا کا ایک عمل ہے جس کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ نام نہاد مطلق سچائی کی کھوج میں یہ ذہنی اعتبار سے آخری حد نہیں حاصل کر سکتی ۔ لیکن دوسری طرف یہ سسٹم اسی مطلق صداقت کی ماہیت ہونے کا دعوی کرتا ہے۔

طبعی اور تاریخی علوم کا وہ نظریہ، جو یہ دعویٰ کرے کہ وہ ہر زمانے کے لئے ہمہ گیر اور حرف آخر ہے، وہ نظریہ جدلیاتی اندازِ فکر کے بنیادی اصول کی ضد ہے۔ جدلیاتی اندازِ فکر یہ دعوی کرتا ہے کہ کائنات کے متعلق ہمارا باقاعدہ علم عہد بہ عہد ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔

جرمن عینیت کی اس غلطی کے احساس نے مادیت کا راستہ دکھایا۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ مادیت اٹھارہویں صدی کی خالص مابعد الطبیعاتی اور میکانکی مادیت نہیں تھی ۔ تمام پچھلی تاریخ سے انکار کرنے کی نسبت جدید مادیت تاریخ کو انسانی ارتقا کا ایک تسلسل خیال کرتے ہوئے اس تسلسل کے قوانینِ حرکت کی جانچ پڑتال کرنا اپنا منصب خیال کرتی ہے ۔ یہ خیال کہ فطرت مجموعی طور پر تنگ دائروں میں حرکت کرتی ہے اور غیر متغیر ہے، اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی فلسفیوں اور ہیگل کے ذہن میں موجود تھا۔ وہ نیوٹن کے اس نظریئے کے قائل تھے کہ اجرام فلکی ابد سے ان تنگ دائروں میں حرکت کر رہے ہیں ۔ وہ لیناس کے اس نظریئے کے بھی قائل تھے کہ قدرت ان نامیاتی ہستیوں کی انواع سے عبارت ہے جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ۔ اس نظریئے کے برعکس جدید مادیت طبعی سائنس کے انکشافات سے استفادہ کرتی ہے ۔ جدید مادیت کے ان انکشافات کی رو سے قدرت بھی اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے ۔ اجرامِ فلکی بھی نامیاتی اجسام کی طرح پیدا ہوتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں ۔ اگر ان اجرام فلکی کے ادوار کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بھی یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان دائروں کے الجھاؤ لامحدودیت میں برابر پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

دونوں صورتوں میں جدید مادیت جدلیاتی ہے ۔ اب جدید مادیت کو کسی ایسے فلسفے کی ضرورت باقی نہیں رہی جو دوسرے علوم سے بالاتر ہو۔ جوں ہی ہر ایک علیحدہ سائنس نے اشیا اور مجموعی نظام میں ان کی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کی، وہ مخصوص سائنس جس کا تعلق مجموعی نظام سے تھا، بیکار ہو گئی ۔ اس وقت پرانے فلسفے کی ایک ہی یادگار باقی رہ گئی ہے، یعنی فکر اور اس کے قوانین کی سائنس _ منطق اور جدلیات ۔ ہر دوسری چیز قدرت اور تاریخ کی اثباتی سائنس میں مدغم ہو چکی ہے۔

کائنات کے متعلق ہمارا تصور اس نسبت سے بدلتا رہا ہے ۔ جس نسبت سے ہمیں کائنات کے متعلق ثبوتی مواد مہیا ہوتا رہا۔ بہت پہلے بعض ایسے تاریخی حقائق پیش آئے جنہوں نے تاریخ سے متعلقہ تصور میں ایک فیصلہ کن تبدیلی پیدا کر دی ۔ 1831 میں لیونز میں پہلی مرتبہ مزدوروں نے شورش کی ۔ 1838 اور 1842 کے درمیان

قومی مزدوروں کی تحریک یعنی انگریز چارٹسٹوں کی تحریک اپنی بلندی تک پہنچ گئی تھی۔ یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں کی تاریخ میں مزدوروں اور سرمایہ داروں کی طبقاتی کشمکش ظاہر ہونے لگی۔ جس رفتار سے نئی انڈسٹری نے ترقی کی اور سرمایہ داروں کا نیا حاصل کردہ سیاسی غلبہ بڑھا اسی رفتار سے یہ جدوجہد بھی بڑھتی چلی گئی۔ حقائق نے پوری شدت کے ساتھ مہاجنی معاشیات کی ان تعلیمات کو سختی سے جھٹلا دیا کہ سرمایہ اور محنت کے مفاد یکساں ہیں، اور یہ کہ بے روک مسابقت سے عام خوشحالی اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اِن تمام چیزوں کو زیادہ دیر تک نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا، نہ ہی فرانسیسی اور جرمن سوشلزم کو جو اِن حقائق کا نظری لیکن بھدا مظہر تھا۔ لیکن تاریخ کا پرانا عینی تصور جس میں ابھی تک تبدیلی نہیں ہوئی تھی، طبقاتی جدوجہد کے نام ہی سے نا آشنا تھا۔ وہ اس طبقاتی جدوجہد سے ناواقف تھا جس کی بنیادیں معاشی مفاد پر تھیں۔ تاریخ کے اس عینی تصور میں پیداوار اور تمام معاشی تعلقات کو محض اتفاقی طور پر بیان کیا جاتا تھا۔ پیداوار اور تمام معاشی تعلقات کو تہذیب کی تاریخ میں ضمنی عوامل قرار دیا جاتا تھا۔

نئے حقائق نے مجبور کر دیا تھا کہ تاریخ پر دوبارہ غور کیا جائے۔ جب اس پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ابتدائی دور کے سوا ساری انسانی تاریخ طبقاتی کشمکش کی تاریخ تھی اور یہ کہ سوسائٹی میں ایک دوسرے سے ٹکرانے والے طبقے ہمیشہ اپنے عہد کے معاشی حالات سے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ آپس میں ٹکرانے والے یہ طبقے پیداوار اور تبادلہ سے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوسائٹی کا معاشی ڈھانچہ ہی وہ حقیقی بنیاد ہے جس پر غور کرنے سے کسی مخصوص عہد کے قانونی اور سیاسی اداروں اور اس عہد کے مذہبی، فلسفیانہ اور دوسرے تصورات کی تشریح کی جا سکتی ہے۔ ہیگل نے تاریخ کے تصور کو مابعدالطبیعات سے الگ کیا۔ اس نے تاریخ کے تصور کو جدلیاتی بنا دیا، لیکن تاریخ کے متعلق اس کا یہ تصور خالص عینی تھا۔ اب عینیت کو اس کی آخری پناہ گاہ یعنی فلسفۂ تاریخ سے بھی باہر نکال دیا گیا۔ اب تاریخ کا ایک مادی تصور پیش کیا گیا۔ اس سے ایک ایسا طریق کار ہاتھ لگا جس کی مدد سے انسان کے شعور کی تشریح اس کے وجود سے کی جانے لگی۔ حالانکہ اس سے پہلے انسان کے وجود کی تشریح اس کے شعور کے حوالہ سے کی جاتی تھی۔

اس کے بعد سے سوشلزم کسی ذہین انسان کا اچانک انکشاف نہیں رہی بلکہ تاریخی طور پر ارتقاپذیر دو طبقوں یعنی مزدوروں اور سرمایہ داروں کی کش مکش کا لازمی نتیجہ قرار پائی۔ سوشلزم کا اب یہ کام نہیں رہا تھا کہ وہ سوسائٹی کے لئے کوئی مکمل نظام مرتب کرے بلکہ اس کا کام یہ تھا کہ وہ واقعات کے تاریخی اور معاشی تسلسل کی جانچ پڑتال کرے جس کی وجہ سے یہ نئے طبقے پیدا ہوئے ہیں۔ نیز ان نئے معاشی حالات کی تہہ میں چھپی ہوئی اُن قوتوں کی تلاش کرے جو ان طبقوں کی کش مکش کو ختم کر سکتے ہیں۔ لیکن ابتدائی دنوں میں سوشلزم، تاریخ کے مادی تصور سے اتنا ہی بے میل تھا جتنا کہ قدرت کے متعلق فرانسیسی مادیت، جدلیات اور نئی طبعی سائنس کے متضاد تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ

ابتدائی سوشلزم نے موجود سرمایہ دارانہ طریقِ پیداوار اور اس کے نتائج پر تنقید تو کی تھی لیکن وہ ان کی تشریح نہیں کر سکتا تھا اور نہ ان پر پورا پورا عبور حاصل کر سکتا تھا۔ ابتدائی سوشلزم موجودہ طریق پیداوار اور اس کے نتائج کو صرف ایک برائی جان کر اسے رَد کر سکتی تھی۔ یہ ابتدائی سوشلزم مزدوروں کے لُوٹے جانے کی جتنی شدت مذمت کرتا اتنا ہی وہ اس بات کی وضاحت میں ناکام رہتا کہ آخر یہ لوٹ ہے کیا اور یہ کیوں پیدا ہوئی؟ اس کے لئے ضروری تھا کہ ایک طرف تو سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کو اس کے تاریخی تسلسل میں پیش کیا جاتا اور یہ بتایا جاتا کہ ایک مخصوص تاریخی دور کے لئے یہ نظام اٹل تھا۔ پھر اس امر کی بھی وضاحت کی جاتی کہ جس طرح اس نظام کا آنا اٹل تھا، اس طرح اس نظام کا ختم ہو جانا بھی اٹل ہے اور دوسری طرف اس نظام کی ہیئیت کی وضاحت کی ضرورت تھی جو ابھی تک اوجھل تھی۔ زائد قدر کے معلوم کر لئے جانے کے بعد ایسا ہی ہوا، چنانچہ معلوم ہوا کہ سرمایہ دارانہ طریق پیداوار اور اس میں مزدوروں کے لٹنے کی بنیاد اصل میں اس محنت کی لوٹ ہے جس کی اجرت مزدوروں کو نہیں دی جاتی۔ اگر سرمایہ دار مزدور کی قوت محنت کو ایک جنس کی حیثیت سے اس کی بازاری قدر پر خریدے تب بھی اس نے جتنی قدر ادا کی ہے اس سے زیادہ قدر اس نے اس قوتِ محنت سے حاصل کر لی ہے۔ یہی زائد قدر، قدر کا وہ ذخیرہ بن جاتی ہے جس کی وجہ سے ملکیت رکھنے والے طبقوں کے پاس سرمایہ کے انبار لگ جاتے ہیں۔ اس طرح سرمایہ دارانہ طریق پیداوار انہ اور سرمایہ کی تخلیق دونوں کی تشریح ہو گئی۔ تاریخ کے مادی تصور اور زائد قدر کے انکشاف کے لئے ہم مارکس کے مرہون منت ہیں۔ زائد قدر کے انکشاف نے سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کے راز کو فاش کر دیا۔ ان انکشاف کے بعد سوشلزم ایک سائنس بن گیا جس کے تمام پہلوؤں اور ان کے باہمی تعلقات کی وضاحت کرنا سب سے اہم کام ہو گیا۔

تیسرا باب

تاریخ کا مادی نظریہ اس اصول سے شروع ہوتا ہے کہ پیداوار اور پیداوار کی اجناس کا تبادلہ ہر سوشل نظام کی بنیاد ہے۔ انسانی تاریخ میں جو سوسائٹی بھی پائی جاتی ہے۔ اس میں پیداوار کی تقسیم اور طبقہ بندی کا انحصار اس بات پر رہا ہے کہ سوسائٹی کیا پیدا کرتی ہے، کیسے پیدا کرتی ہے۔ اور اس میں پیداوار کی تقسیم کس طرح ہوتی ہے۔ تاریخ کے اس نظریئے کے مطابق تمام سماجی تبدیلیوں اور سیاسی انقلابوں کے بنیادی اسباب کو انسانوں کے ذہنوں یا ابدی صداقت اور عدل میں ان کی بڑھتی ہوئی بصیرت میں تلاش نہیں کرنا چاہیے بلکہ انہیں طریق پیداوار اور تبادلہ کی

تبدیلیوں میں دیکھنا چاہئے۔ان کے عہد بہ عہد اسباب کو فلسفے کی جگہ معاشیات میں تلاش کرنا چاہئے۔ یہ بڑھتا ہوا احساس کہ موجودہ سماجی ادارے نامعقولیت اور بے انصافی پر مبنی ہیں، عقل حماقت میں بدل چکی ہے اور خیر نے شر کی صورت اختیار کر لی، اس بات کی علامت ہے کہ پیداوار اور تبادلے کی صورتیں چپکے چپکے تبدیل ہوتی رہی ہیں اور اس تبدیلی کے ساتھ ہی وہ سماجی ڈھانچہ بھی، جو سابقہ معاشی حالات نے بنایا تھا، اب نئے حالات سے مطابقت نہیں رکھتا۔لیکن نئے نظام میں جو خرابیاں ظاہر ہوئی ہیں ان سے رہائی پانے کے ذرائع بھی پیداوار کے ان بدلے ہوئے طریقوں میں کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ان ذرائع کی تلاش کے لئے کسی ذہنی اختراع کی ضرورت نہیں بلکہ پیداوار کے موجودہ مادی حقائق میں ان کی تلاش کی جائے۔

اس اصول کے مطابق موجودہ سوشلزم کی کیا حیثیت ہے؟

موجودہ سماجی ڈھانچہ، جیسا کہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، موجودہ حکمران طبقے یعنی سرمایہ داروں کا بنایا ہوا ہے۔سرمایہ داروں کا مخصوص طریق پیداوار جو مارکس کے بعد سے سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کہلاتا ہے۔وہ مقامی اور خاندانی مراعات اور جاگیری نظام کے ذاتی تعلقات میں نہیں کھپ سکتا تھا۔سرمایہ داروں نے جاگیری نظام پاش پاش کر دیا۔انہوں نے اس نظام کے کھنڈروں پر نیا نظام کھڑا کیا۔انہوں نے تجارت میں آزاد مسابقت اور نقل و حرکت میں آزادی پیدا کی۔اجناسِ تبادلہ کے مالکوں کے لئے مساوی حقوق اور سرمایہ داروں کے لئے عروج کے مختلف سامان پیدا ہو گئے۔ان حالات میں سرمایہ دارانہ طریق پیداوار آزادی کے ساتھ ترقی کر سکتا تھا۔جب سے بھاپ اور کل پرزے بنانے والی مشینری نے پرانی کارخانہ داری کو ختم کر کے بڑے پیمانے پر انڈسٹری کو فروغ دیا، اس وقت سے سرمایہ داروں کی رہنمائی میں پیداواری قوتوں نے اتنی تیز رفتاری سے ترقی کر لی کہ ماضی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔جس طرح ابتدائی کارخانہ داری اور دستکاری جس نے جاگیری نظام میں پرورش پائی تھی، آخر کار جاگیری نظام میں جکڑے ہوئے گلڈوں سے متصادم ہوئی، اسی طرح بڑے پیمانے کی نئی انڈسٹری، جب وہ پوری طرح سے ترقی کر جاتی ہے، تو وہ بھی ان حد بندیوں سے ٹکراتی ہے جن کے اندر سرمایہ دارانہ طریق پیداوار نے نئی انڈسٹری کو جکڑ رکھا ہے۔پیداوار کی نئی قوتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ اب سرمایہ دارانہ طریق پیداوار میں ان کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔پیداوار کی قوتوں اور طریقِ پیداوار میں جو تصادم پایا جاتا ہے وہ اولین گناہ اور الٰہی عدل کی طرح انسانوں کے ذہن میں پیدا نہیں ہوا۔یہ تصادم ہمارے ذہن سے باہر کی دنیا میں موجود ہے۔یہ تصادم اپنے پیدا کرنے والوں کی خواہشوں اور ارادوں سے بھی آزاد ہے۔جدید سوشلزم اسی حقیقی تصادم کو ہمارے ذہن پر منعکس کرتی ہے۔اس کا سب سے واضح عکس سب سے پہلے اس طبقے کے ذہن پر پڑتا ہے۔جو براہِ راست اس تصادم کا شکار ہے، یعنی محنت کرنے والا طبقہ۔

یہ تصادم کہاں پایا جاتا ہے۔؟

سرمایہ دارانہ سے پہلے ازمنہ وسطیٰ میں چھوٹے پیمانے پر پیداوار ہوتی تھی۔ جس میں کام کرنے والے اپنے ذرائع پیداوار کے مالک ہوتے تھے۔ دیہات میں چھوٹے چھوٹے کسان آزاد کاشتکار اور زرعی غلام کھیتی باڑی کرتے تھے۔ شہروں میں دستکاری ہوتی تھی۔ چونکہ آلاتِ محنت انفرادی استعمال اور انفرادی ملکیت رکھتے تھے، اس لئے وہ بہت ناقص اور بھدے ہوتے تھے۔ ان کا استعمال بھی محدود ہوتا تھا۔ یہ آلات کام کرنے والے ہی کی ملکیت ہوتے تھے۔ ان محدود اور بکھرے ہوئے ذرائع پیداوار کو اکٹھا کرنا، بڑھانا اور پھر انہیں ترقی دے کر دورِ حاضر کی عظیم الشان پیداآوری قوتوں میں منتقل کردینا سرمایہ دارانہ طریق پیداوار اور اس کے نمائندوں یعنی سرمایہ داروں کا ایک تاریخی کارنامہ ہے۔

کارل مارکس اپنی کتاب سرمایہ کے چوتھے حصے میں تفصیل سے بتاتا ہے کہ کس طرح پندرھویں صدی کے بعد ذرائع پیداوار کی ترقی کا یہ سلسلہ ابتدائی تعاون، کارخانہ داری اور بڑے پیمانے کی انڈسٹری کے تین ادوار میں سے گزر چکا ہے۔ مارکس یہ بھی بتاتا ہے کہ سرمایہ داروں نے ان محدود ذرائع پیداوار کو ترقی دے کر بڑی بڑی پیداآوری قوتوں کو اپنا مطیع کیا۔ لیکن ایسا کرنے میں انہوں نے انفرادی ذرائع پیداوار کو تبدیل کرکے انہیں اجتماعی ذرائع پیداوار کی شکل دے دی۔ جولاہے کے کرگھے اور چرخے کی جگہ سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی بڑی بڑی مشینوں نے لے لی۔ لوہار کے ہتھوڑے کی جگہ بھاپ سے چلنے والے مشینی ہتھوڑوں نے لے لی۔ کاریگروں کی چھوٹی چھوٹی دکانوں کے بدلے بڑی بڑی فیکٹریاں قائم ہوگئیں۔ جہاں ہزاروں مزدوروں کا ایک ساتھ مل کر کام کرنا ضروری ہوگیا۔ ذرائع پیداوار کی طرح خود پیداوار میں بھی نمایاں تبدیلی ہوئی۔ ایک شخص سارے کام کرنے کی جگہ صرف ایک ہی مخصوص کام کرنے لگا۔ انفرادی پیداوار کی جگہ اجتماعی پیداوار نے لے لی۔ اب جو مصنوعات، مثلاً سوت، کپڑا، اور دھات کی چیزیں فیکٹری سے باہر آنے لگیں وہ مزدوروں کی مشترکہ محنت کا ثمر تھیں کیونکہ ان کی تیار کئے جانے میں انہیں مختلف مزدوروں کے ہاتھوں میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ ان اجناس کی بارے میں اب کوئی ایک شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس نے بنائی ہیں۔

جس سوسائٹی میں محنت کی قدرتی تقسیم ہی پیداوار کی بنیاد ہو، وہاں حاصلپیداوار جنسِ تبادلہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ الگ الگ کام کرنے والے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کا خرید وفروخت کے ذریعے باہمی تبادلہ کرکے اپنی بہت سی ضرورتوں کو پورا کرلیتے ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ میں سوسائٹی کی یہی حالت تھی۔ مثال کے طور پر کسان اپنی زرعی پیداوار کاریگر کے ہاتھ بیچ کر اس کے بدلے کاریگر کی بنائی ہوئی چیزیں خریدتا۔ انفرادی پیداوار کی اس سوسائٹی میں ایک نئے طریقِ پیداوار کا ظہور ہوا۔ ابتدائی تقسیم محنت کے ساتھ ساتھ جس میں منصوبہ بندی کا کوئی دخل نہیں تھا۔

الگ الگ فیکٹریوں میں منصوبہ بندی کے تحت محنت کی تقسیم ہونے لگی۔ انفرادی پیداوار کے ساتھ ساتھ اجتماعی پیداوار نے بھی سر نکالا۔ انفرادی اور اجتماعی تقسیم محنت سے تیار شدہ اجناس ایک ہی منڈی میں فروخت ہوتی تھیں۔ دونوں قسم کی محنت سے تیار شدہ اجناس کی قیمتوں میں بھی کم وبیش کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ لیکن قدرتی تقسیم محنت کی نسبت منصوبہ بندی کے ماتحت کی گئی تقسیم محنت زیادہ مضبوط تھی۔ ان فیکٹریوں نے، جہاں محنت کو اجتماعی طور پر منظم کیا گیا تھا، انفرادی محنت کرنے والوں کی نسبت سستی اجناس پیدا کرنی شروع کردیں۔ آہستہ آہستہ انفرادی محنت سے اجناس پیدا کرنے والے مٹتے چلے گئے۔ اجتماعی پیداوار نے طریق پیداوار میں انقلاب پیدا کردیا۔ اس انقلاب کو اِس سے زیادہ نہ سمجھا گیا کہ وہ اجناس کی پیداوار کو بڑھانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ نئے طریق پیداوار کا رشتہ شروع ہی سے بعض ایسی چیزوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا جو جنس کی پیداوار اور تبادلے میں مدومعاون تھیں اور جن کا وجود پہلے ہی سا تھا، یعنی تجارتی سرمایہ۔ دستکاری اور اجرتی محنت چونکہ یہ نیا طریق پیداوار جنس تبادلہ کی پیداوار کا وجود لے کر آیا تھا اس لئے تصرف کے وہ طریقے جو جنس تبادلہ کی پیداوار کے ساتھ مخصوص تھے، بدستور اپنی جگہ پر قائم رہے۔

ان حالات میں جن میں ازمنہ وسطیٰ میں جنس تبادلہ کی پیداوار نے ترقی کی تھی، یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ محنت کا حاصل کس کی ملکیت ہے۔ انفرادی پیدا کنندہ نے اسے پیدا کیا تھا۔ اس نے جس کچے مال اور جن آلاتِ محنت سے اسے پیدا کیا تھا وہ سب کے سب اس کے اپنے یا اس کے خاندان کی ملکیت ہوتے تھے اس لئے اسے پیداوار پر اپنا حقِ ملکیت جتانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اپنی محنت سے پیدا کی ہوئی چیز اپنی نہیں ہوگی تو کس کی ہوگی؟ اس کی ملکیت کا انحصار اس کی اپنی محنت پر ہوتا تھا۔ جب کبھی کسی دوسرے کی محنت کو حاصل کیا جاتا تو اسے اجرت کے علاوہ اور بھی کچھ نہ کچھ دیا جاتا تھا۔ گلڈوں میں جو شاگرد یا کاریگر کام کرتے تھے ان کے پیش نظر اجرت اور خوراک نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کا مقصد دستکاری میں مہارت حاصل کرنا ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ دور آیا جب ذرائع پیداوار کو بڑے بڑے کارخانوں میں جمع کیا جانے لگا۔ ان کارخانوں میں اجتماعی ذرائع پیداوار اختیار کئے گئے لیکن اجتماعی ذرائع پیداوار اور اجتماعی محنت کے حاصل کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ انہیں پرانے ذرائع پیداوار اور انفرادی محنت کا حاصل سمجھ لیا گیا۔

اب تک آلاتِ محنت کا مالک ہی پیداوار کا مالک ہوتا تھا کیونکہ وہ اس کی اپنی محنت کا حاصل ہوتا تھا۔ اسے کبھی کبھار ہی دوسروں کی محنت کی ضرورت پڑتی تھی۔ لیکن نئے حالات میں بھی آلاتِ محنت کا مالک 'حاصل کا مالک' بنا رہا حالانکہ اب وہ اس کی محنت کا حاصل نہیں رہا تھا بلکہ وہ سراسر دوسروں کی محنت کا نتیجہ تھا۔ اس طرح جو اجناس اجتماعی محنت سے پیدا کی جاتی تھیں اُن پر ان لوگوں کا قبضہ نہ رہا جنھوں نے ذرائع پیداوار کو حرکت دی تھی

اور اجناس کو پیدا کیا تھا بلکہ ان پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہوگیا۔ ذرائع پیداوار اور پیداوار اجتماعی ہو چکی تھی لیکن ملکیت کا طریقہ ایسا رہا جس میں پہلے ہی سے یہ مان لیا گیا تھا کہ افراد الگ الگ اجناس پیدا کرتے ہیں اور جس میں ہر شخص اپنے حاصل کا مالک ہے اور اسے فروخت کرنے کے لئے منڈی میں لے آتا ہے۔ طریق پیداوار پر اسی قسم کا تصرف حاوی رہا حالانکہ طریق پیداوار نے ان بنیادوں کو ڈھا دیا تھا جن پر اس کا انحصار تھا۔ اسی تضاد میں، جو نئے طریق پیداوار کو سرمایہ دارانہ صورت دیتا ہے، آج کل کی کشمکش کا جرثومہ موجود ہے۔ جوں جوں نیا طریق پیداوار، پیداوار کے تمام اہم شعبوں میں برتری حاصل کرتا گیا اور ہر ملک میں ایک فیصلہ کن معاشی اہمیت حاصل کرتا رہا، ویسے ویسے انفرادی پیداوار کی اہمیت گھٹتے گھٹتے صرف نشانات تک باقی رہ گئی اور مشترکہ پیداوار اور سرمایہ دارانہ ملکیت کا تضاد زیادہ نمایاں ہوتا چلا گیا۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ابتدائی سرمایہ داروں نے اُجرتی محنت کے دستور کو موجود پایا لیکن اجرتی محنت استثنائی اور ضمنی حیثیت رکھتی تھی۔ لوگ صرف اسی صورت میں اجرتی محنت کو کام میں لاتے تھے جبکہ انہیں اپنی آمدنی بڑھانا مقصود ہوتا تھا۔ زرعی مزدور کبھی کبھار اپنے کھیت سے ہٹ کر مزدوری کرنے نکل جاتا لیکن اس کے پاس بھی اتنی زمین ہوتی تھی جس سے وہ اپنی روزی کما سکتا تھا۔ گلڈوں کے اصول ایسے ہوتے تھے کہ آج کا اجرتی مزدور کل کا اُستاد کاریگر بن جاتا۔ لیکن جونہی ذرائع پیداوار نے اجتماعی صورت اختیار کی اور وہ سرمایہ دار کے تصرف میں چلے گئے، یہ صورت حالات بدل گئی۔ چھوٹے چھوٹے انفرادی پیدا کنندوں کے ذرائع پیداوار اور پیداوار کی قدر گھٹنی شروع ہوگئی۔ اس کے لئے یہی چارۂ کار رہ گیا تھا کہ وہ کسی سرمایہ دار کے ہاں جا کر اجرت پر مزدوری کرے۔ اس وقت تک اجرتی محنت ایک استثنائی اور امدادی حیثیت رکھتی تھی لیکن اب وہ پیداوار کا اصول اور بنیاد بن گئی۔ اس وقت تک جب کبھی محنت کرنے والے کو زائد آمدنی کی ضرورت ہوتی تو وہ اجرت پر کام کرتے لیکن اب اجرت پر کام کرنا ہی ان کی روزی کا ذریعہ ہوگیا۔ کبھی کبھار کا اجرتی مزدور اب عمر بھر کے لئے اجرتی مزدور بن گیا۔ جاگیری نظام کے بکھرنے کے ساتھ ہی ان عمر بھر کے اجرتی مزدوروں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔ ان کی تعداد بڑھانے میں جاگیری ملازموں کی علیحدگی اور کسانوں کی اُن کے گھر بار اور ان کے کھیتوں سے بے دخلی کو بھی دخل ہے۔ ذرائع پیداوار سمٹ سمٹا کر سرمایہ داروں کے قبضے میں چلے گئے۔ پیدا کنندوں کے پاس اپنی قوت محنت کے سوا اور کچھ نہ رہا۔ اس طرح پیدا کنندوں سے پیداوار کا تعلق مٹ گیا۔ اجتماعی پیداوار اور سرمایہ دارانہ تصرف کا تضاد مزدوروں اور سرمایہ داروں کے باہمی نزاع کی صورت میں ظاہر ہوا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سرمایہ دارانہ طریق پیداوار نے کس طرح اپنے آپ کو ایک ایسی سوسائٹی پر تھوپ دیا تھا جس میں لوگ انفرادی طور پر تبادلے کے لئے اجناس پیدا کرتے تھے اور جہاں یہی تبادلہ ان کے سماجی اتحاد کا

ذریعہ تھا لیکن تبادلے کے لئے جنس پیدا کرنے والی ہر سوسائٹی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں پیدا کنندوں کو اپنے سوشل تعلقات پر کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ ہر پیدا کنندہ اپنے ذرائع پیداوار سے اپنے لئے جو جنس تیار کرتا ہے اس کے تبادلے سے وہ اپنی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس نے جو جنس تیار کی ہے اس کا کتنا حصہ بازار میں آنے والا ہے یا یہ کہ بازار میں اس جنس کی کتنی ضرورت ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس نے جو جنس تیار کی ہے اس کا کتنا حصہ بازار میں آنے والا ہے یا یہ کہ بازار میں اُس جنس کی کتنی ضرورت ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کی انفرادی محنت سے پیدا شدہ جنس کسی حقیقی ضرورت کو پورا بھی کرے گی یا نہیں یا یہ کہ وہ اس کی لاگت پوری کر سکے گا یا اسے بیچ بھی سکے گا۔ اجتماعی پیداوار میں نراج کا غلبہ شروع ہو جاتا ہے۔ پیداوار کے دوسرے طریقوں کی طرح جنس کی پیداوار بھی اپنے قانون رکھتی ہے۔ یہ قوانین اس کے اپنے اندر موجود ہوتے ہیں۔ انہیں جنس کی پیداوار سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ قوانین نراج کے ہوتے ہوئے اور نراج ہی کے ذریعہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ یہ قوانین اس مجلسی تعلق میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں جو تبادلے کے عمل میں برابر موجود رہتا ہے۔ یہ قوانین انفرادی پید اکنندوں پر مسابقت کے لازمی قوانین کی حیثیت سے اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اسی لئے شروع شروع میں پیدا کنندوں کو بھی ان کا پتہ نہیں چلتا۔ ایک طویل تجربے کے بعد انہیں ان قوانین کی خبر ہوتی ہے۔ یہ قوانین پیدا کنندوں کے منشا کے بغیر اور ان کی مرضی کے خلاف اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ پیداوار کے یہ قدرتی قوانین اندھا دھند اپنا کام کرتے چلے جاتے ہیں۔ پیداوار پیدا کنندوں پر غالب آ جاتی ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ میں اور خاص کر اس کی ابتدائی صدیوں میں پیداوار پیدا کنندوں کی ضرورت کے مطابق ہوتی تھی۔ پیداوار کا مقصد پیدا کنندہ اور اُس کے گھر والوں کی ضروریات کو پورا کرنا تھا۔ دیہات میں، جہاں کسان جاگیرداروں کے ماتحت ہوتے تھے، وہاں اس پیداوار سے جاگیرداروں کی بھی ضرورتیں پوری کی جاتی تھیں۔ چونکہ اس زمانے میں اجناس کے تبادلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لئے پیداوار، جنس تبادلہ کی صورت اختیار نہیں کر سکتی تھی۔ ایک کسان کا گھرانہ اپنی ضرورت کی تقریباً تمام چیزیں خود پیدا کرتا تھا، یعنی خوراک، کپڑا اور برتن۔ لیکن جب کسان اپنی ضرورتوں اور جاگیردار کے واجب الادا حصے سے زیادہ پیدا کرنے لگا۔ تب پیداوار نے جنس تبادلہ کی صورت اختیار کی۔ یہ زائد پیداوار بکنے کے لئے بازار میں آ گئی۔ اب یہ پیداوار جنس تبادلہ بن گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شہر میں رہنے والے کاریگر بھی اپنی ضرورت کی بیشتر چیزیں خود ہی تیار کر لیتے تھے۔ وہ باغوں اور چھوٹے چھوٹے کھیتوں کے مالک ہوتے تھے۔ ان کے مویشی مشترکہ چراگاہوں میں چرتے۔ ان سے انہیں عمارتی لکڑی اور ایندھن بھی مل جاتا تھا۔ ان کی عورتیں گھروں میں سَن اور اون کاتتیں۔ پیداوار کو تبادلے کی شکل دینے یعنی پیداوار کو اجناس تبادلہ میں بدلنے کا یہ ابتدائی دور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں تبادلہ بہت

محدود تھا۔ بازار بہت چھوٹا تھا۔ اور طریق پیداوار ایک ہی حال پر رہتا تھا۔ اس دور کے پیدا کنندوں کا بیرونی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا لیکن ان میں پورا پورا مقامی اتحاد ہوتا تھا۔ دیہات میں پنچائیت تھی اور شہر میں مارک۔

جنس تبادلہ کی وسعت کے ساتھ ہی اور خاص کر سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کے رواج پاتے ہی جنس تبادلہ کی پیداوار کے وہ قانون جواب تک چھپے ہوئے تھے زیادہ قوت کے ساتھ ابھر آئے۔ پرانے تعلقات کی کڑیاں ڈھیلی ہونے لگیں۔ الگ الگ رکھنے والی پرانی حد بندیاں ٹوٹ گئیں۔ پیدا کنندے بڑی تیزی سے آزادانہ طور پر الگ الگ اجناسِ تبادلہ پیدا کرنے والوں میں بدلتے گئے۔ اجتماعی پیداوار کی انارکی ظاہر ہو کر روز بہ روز بڑھنے لگی۔ لیکن جس ذریعہ سے سرمایہ دارانہ طریق پیداوار نے اجتماعی پیداوار میں انارکی کو بڑھا دیا تھا۔ وہ انارکی کی ضد تھا، یعنی کارخانوں میں جہاں الگ الگ چیزیں تیار کی جاتی ہوں وہاں پیداوار کی تنظیم اجتماعی بنیاد پر کی جائے۔ یہی وہ لیور تھا جس کی مدد سے اس نے سابقہ پُر امن یکسانیت کو ختم کر دیا۔ اس نے انڈسٹری کے جس شعبے میں بھی قدم رکھا۔ وہاں پیداوار کے پرانے طریق قائم نہ رہ سکے۔ اس نے جس دستکاری کی طرف ہاتھ بڑھایا اسے ملیا میٹ کر کے چھوڑا۔ محنت کا میدان لڑائی کا میدان بن گیا۔ بڑے بڑے جغرافیائی انکشافات اور اُن سے پیدا شدہ نو آبادیات نے منڈیوں کی تعداد بڑھا دی جس سے دستکاری کو کارخانہ داری میں بدلے جانے میں بڑی مدد ملی۔ نہ صرف مقامی پیدا کنندوں میں یہ کشمکش شروع ہوئی بلکہ یہ مقامی کشمکش قومی کشمکش بن گئی۔ سترھویں اور اٹھارہویں صدیوں کی لڑائیاں اسی کش مکش نے پیدا کی تھیں۔ آخر کار جب بڑے پیمانے پر انڈسٹری جاری ہوئی تو عالمگیر منڈیوں کے حصول نے اس کش مکش کو بھی بین الاقوامی بنا دیا۔ اس بین الاقوامی کش مکش نے اتنی شدت اختیار کر لی جس کی مثال پہلے نہیں ملتی۔ پیداوار کی قدرتی یا مصنوعی سہولتوں پر نہ صرف انفرادی سرمایہ داروں بلکہ صنعتوں اور مُلکوں کی زندگی اور موت کا انحصار ہونے لگا۔ اس کش مکش میں جو گر پڑتا ہے اسے راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ ڈارون کا یہ نظریہ کہ ہر فرد کو اپنی بقا کے لئے کش مکش کرنی پڑتی ہے، قدرتی حالات سے ہٹ کر سوسائٹی پر بڑی شدت کے ساتھ حاوی ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس اصول کے تحت حیوان زندگی بسر کرتا ہے وہی اصول انسانی ارتقا کے لئے حرفِ آخر بن گیا۔ اجتماعی پیداوار اور سرمایہ دارانہ تصرف کے تضاد ہی نے اس تضاد کو پیدا کر دیا ہے جو الگ الگ کارخانے کی پیداوار کی تنظیم اور مجموعی طور پر سوسائٹی میں پیداوار کی انارکی میں پایا جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ طریق پیداوار اس تضاد کے ان دو مظاہر ہی میں حرکت کرتا رہتا تھا۔ یہ تضاد اس کے خمیر میں ہے۔ سرمایہ دارانہ طریق پیداوار اس چکر سے بچ کر نہیں نکل سکتا جس کی طرف فوریئے نے اشارہ کیا تھا۔ لیکن فوریئے اپنے زمانے میں یہ نہ دیکھ سکا کہ یہ چکر آہستہ آہستہ تنگ ہو رہا ہے اور اس چکر کی حرکت دائروی نہیں بلکہ بیضوی ہے جو ایک نہ ایک دن سیاروں کی حرکت کی طرح مرکز سے ٹکرا کر ختم ہو جائے گی۔ سماج میں پیداوار کی

انارکی کی شدت ہی لوگوں کی زیادہ تعداد کو مزدور بنا رہی ہے اور آخر کار یہی محنت کش طبقہ ایک دن پیداوار کی انارکی کو ختم کر دے گا۔ سماج میں پیداوار کی انارکی کی شدت ہی سے بڑے پیمانے کی انڈسٹری میں مشینوں میں برابر ترقی کرتے رہنے کی لامحدود صلاحیت ایک جبری فرمان کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جس کی رو سے ہر انفرادی سرمایہ دار اپنی مشین کو زیادہ سے زیادہ مکمل بنانے کی فکر میں رہتا ہے کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اسے اپنی تباہی کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ لیکن مشینری کو مکمل کرنے کا مقصد انسانی محنت کو فاضل بنانا ہے۔ شروع میں جب مشینیں ایجاد ہوئیں اور پھر ان میں توسیع ہوئی تو ہاتھ سے کام کرنے والوں کی جگہ مشین پر کام کرنے والے مزدوروں نے لے لی۔ اسی طرح جوں جوں مشینری مکمل ہوتی جائے گی، مشین پر کام کرنے والے ان مزدوروں کی تعداد بھی بیکار ہوتی چلی جائے گی۔ یہاں تک کہ اجرتی مزدوروں کی ایک ایسی فوج تیار ہو جائے گی جس کی محنت کی سرمایہ داروں کو ضرورت نہیں رہے گی۔ ایک ایسی فوج جسے میں نے 1845 میں صنعتی ریزرو فوج کہا تھا۔ جو اس وقت کام پر لگائی جائے گی جب کہ کارخانے بڑے زوروں پر ہوں گے۔ لیکن اس وقت جبکہ مندی ہو گی اور اس فوج کو سڑکوں پر چھوڑ دیا جائے گا -- ایک ایسی ریزرو فوج، جو اس سارے مزدور طبقے کے لئے جو سرمایہ داروں کے ساتھ زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہا ہے، گلے کا ہار بن جائے گی۔ یہ فاضل فوج ایک ایسی 'کل' بن جائے گی جس کی مدد سے سرمایہ دار اپنی مرضی کے مطابق مزدوروں کی اجرت گھٹا سکیں گے۔ اس طرح مشین کارل مارکس کے الفاظ میں مزدوروں کے خلاف سرمایہ داروں کی جنگ میں سرمایہ کا سب سے قوی ہتھیار بن جاتی ہے۔ یہی آلاتِ محنت مسلسل طور پر مزدوروں کے ہاتھ سے ان کی روزی کا ذریعہ تک چھین لیتے ہیں۔ مزدور کی محنت کا حاصل اسے غلام بنانے کا ایک آلہ بن جاتا ہے۔ اس طرح محنت کرنے کے لئے جن حالات کی ضروت ہوتی ہے۔ انہیں برباد کر دیا جاتا ہے۔

''مشین ہی وہ طاقتور آلہ ہے جس سے اوقاتِ محنت کم کئے جاتے ہیں اور جو مزدور اور اس کے گھر والوں کی زندگی کے ایک ایک لمحے کو سرمایہ دار کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہے تا کہ وہ اپنے سرمایہ کی قدر بڑھا سکے۔'' (سرمایہ جلد اول)

اس طرح چند ایک کی بے حد محنت دوسروں کی بیکاری کا ذریعہ بن جاتی ہے اور بڑے پیمانے کی انڈسٹری جو ساری دنیا میں نئے خریداروں کی تلاش میں رہتی ہے، اپنے ملک کے عوام کی قوتِ خرید کو فاقہ کشی کی حد تک کم کر کے اپنی داخلی منڈی کو برباد کر دیتی ہے۔

''وہ قانون جو اضافی فاضل آبادی یا صنعتی ریزرو فوج کی تعداد یا سرمایہ کے بڑھنے کی قوت میں توازن قائم رکھتا ہے مزدوروں کو سرمایہ کے ساتھ اس طرح جکڑ دیتا ہے کہ ولکن نے بھی پرومیتھیئس کو چٹان کے ساتھ اِس طرح نہیں جکڑا ہو گا۔ سرمائے کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اسی تیزی کے ساتھ مصیبت

بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایک طرف اگر دولت جمع ہونا شروع ہوتی ہے تو دوسری طرف مصیبت، دکھ، غلامی، جہالت، بربریت اور ذہنی پستی پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب ذلتیں اس طبقے کے لئے ہوتی ہیں جو اپنی محنت کے حاصل کو سرمایہ کی صورت میں پیدا کرتا ہے۔'' (سرمایہ، جلد اول)

سرمایہ دارانہ طریق پیداوار سے یہ توقع کرنا کہ پیداوار کی تقسیم کسی دوسری صورت میں بھی ہو سکتی ہے، ایسا ہی ہے جیسے چالو بیٹری کے الیکٹروڈوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ پانی کے اجزا کو الگ الگ نہیں کریں گے اور مثبت اور منفی سروں پر آکسیجن اور ہائیڈروجن جمع نہیں ہوگی۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ جدید مشینری میں ترقی کرنے کی جو صلاحیت ہے وہ سوسائٹی کی پیداوار کے نراج کے سبب اپنی انتہا کو پہنچ جانے کے بعد ایک جبری قانون کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ہر صنعتی سرمایہ دار مجبور ہے کہ اپنی مشینری میں نت نئی اصلاح کرتا رہے اور اس کی پیداواری قوت کو بڑھاتا رہے۔ اپنی پیداوار بڑھانے کا امکان بھی صنعتی سرمایہ دار کے لئے ایک جبری قانون بن جاتا ہے۔ بڑے پیمانے کی انڈسٹری میں گیس کی روشنی سے بھی زیادہ پھیلنے کی قوت ہے۔ پھیلنے کی یہ قوت اپنی کمیت اور کیفیت کی وسعت کے لحاظ سے ہمیں بظاہر ایک ضرورت دکھائی دیتی ہے جو کسی قسم کی رکاوٹ کی پروا نہیں کرتی۔ اس قسم کی رکاوٹ کھپت، فروخت اور وہ منڈیاں پیدا کرتی ہیں جو بڑے پیمانے کی انڈسٹری کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ لیکن منڈی کے وسیع اور عمیق پھیلاؤ کا انحصار دوسرے اور نسبتاً کم موثر قوانین پر ہوتا ہے۔ منڈی کا پھیلاؤ پیداوار کے پھیلاؤ کی نسبت سے نہیں ہوتا۔ پیداوار جس رفتار سے ترقی کرتی ہے اس رفتار سے منڈی ترقی نہیں کرتی۔ تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہ تصادم اس وقت تک کوئی حل پیش نہیں کر سکتا جب تک کہ سرمایہ دارانہ طریق پیداوار ختم نہ ہو جائے۔ چنانچہ یہ تصادم وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ سرمایہ دارانہ طریق پیداوار اپنے ساتھ ایک نیا برائی کا چکر لاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 1829 سے، جبکہ پہلی مرتبہ عمومی بحران پیدا ہوا، ہر دس سال کے بعد ساری صنعتی اور تجارتی دنیا میں ہر مہذب قوم اور اس کی محکوم قوم کی پیداوار اور تبادلے میں عملاً انتشار پیدا ہوتا رہا ہے۔ جب یہ بحران پیدا ہوتا ہے تو کاروبار بند ہو جاتا، منڈیوں میں اجناس کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ اجناس کے ذخیرے بن جاتے ہیں۔ ان کے خریدار نہیں ملتے۔ نقدی غائب ہو جاتی ہے۔ روپے پیسے کا لین دین ختم ہو جاتا ہے۔ کارخانے بیکار ہو جاتے ہیں۔ بے شمار مزدور روزگار کے ذرائع سے اس لئے محروم ہو جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے ضرورت سے زیادہ اجناس پیدا کر لی ہیں۔ دیوالے پر دیوالہ نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ نیلام پر نیلام بولتا ہے۔ یہ جمود کئی سال تک جاری رہتا ہے۔ پیداوار اور پیداواری قوتیں بڑی مقدار میں ضائع کر دی جاتی ہیں۔ اجناس کو اونے پونے بیچ دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پیداوار اور تبادلے کا عمل پھر آہستہ آہستہ حرکت میں آنے لگتا ہے۔ اس حرکت میں آہستہ آہستہ تیزی پیدا ہوتی ہے۔ دُلکی اور پھر

سرپٹ، یہ سرپٹ حرکت بہت جلد صنعتی تجارتی لین دین اور سٹے بازی کی ایک ایسی دوڑ میں تبدیل ہو جاتی ہے جہاں یہ سب کے سب چھلانگیں بھرتے ہوئے آخر کار ایک بار پھر تباہی کے کنارے پر جا گرتے ہیں۔ بار بار یہی ہوتا رہتا ہے۔1825 کے بعد ہم اس وقت تک پانچ مرتبہ بحران کا تجربہ کر چکے ہیں اور اب 1877 میں ہم چھٹی بار اس سے دو چار ہیں۔ان بحرانوں کی نوعیت اس قدر واضح ہے کہ فوریئے نے سب سے پہلے بحران کے بارے میں یہ کہہ کر کہ وہ "بہتات کا بحران" ہے تمام بحرانوں کو جامع انداز سے بیان کر دیا۔

ان بحرانوں میں اجتماعی پیداوار اور سرمایہ دارانہ تصرف کا تضاد بہت شدت اختیار کر لیتا ہے۔اس وقت اجناس تبادلہ کا چکر تقریباً بند ہو جاتا ہے۔اس چکر کا ذریعہ یعنی زر، چکر میں رکاوٹ پیدا کر دیتا ہے۔اجناس تبادلہ اور اجناس کے چکر کے تمام قوانین الٹ پلٹ جاتے ہیں۔ معاشی تصادم اپنے انتہائی نقطے تک جا پہنچتا ہے۔ پیداوار کا طریقہ تبادلے کے طریقے کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے۔

یہ حقیقت کہ کارخانے کے اندر پیداوار کی اجتماعی تنظیم اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ سوسائٹی میں پیداوار کی انارکی اسے تباہ نہیں کر سکتی۔ یہ بات خود سرمایہ داروں پر واضح ہو جاتی ہے کیونکہ بحرانوں میں اکثر بڑے اور بے شمار چھوٹے سرمایہ داروں کی تباہی سے سرمایہ ایک مرکز پر جمع ہونے لگتا ہے۔سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کے تمام کل پرزے اپنی بنائی ہوئی پیداواری قوتوں کے بوجھ تلے دب کر ٹوٹ جاتے ہیں۔اب یہ بات اُس کے بس میں نہیں رہتی کہ وہ ذرائع پیداوار کے اس انبار کو سرمایہ میں تبدیل کر سکے۔ذرائع پیداوار کا یہ انبار بیکار پڑا رہتا ہے۔ذرائع پیداوار، ذرائع روزگار، مزدور اور پیداوار اور عمومی دولت بڑھانے کے تمام عناصر بہتات سے موجود ہوتے ہیں۔ لیکن فوریئے کے الفاظ میں، یہی بہتات پریشانی اور کمی کا سبب بن جاتی ہے۔یہی بہتات ذرائع پیداوار اور ذرائع روزگار کو سرمایہ میں منتقل ہونے سے باز رکھتی ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ سوسائٹی میں ذرائع پیداوار اس وقت تک کام کرنا شروع نہیں کر سکتے جب تک کہ انہیں سرمایہ میں منتقل نہیں کر دیا جاتا یعنی جب تک انسانی قوت محنت کو لوٹا نہیں جاتا۔ ذرائع پیداوار اور ذرائع روزگار کو سرمایہ میں منتقل کر دیے جانے میں وہ سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان ایک بھوت بن جاتا ہے۔اسی وجہ سے پیداوار کے مادی اور ذاتی ذرائع ایک ساتھ ملنے نہیں پاتے۔اسی وجہ سے ذرائع پیداوار نہ اپنا کام کر سکتے ہیں اور نہ مزدور کام کر کے اپنا پیٹ پال سکتے ہیں۔اس طرح ایک طرف سرمایہ دارانہ طریق پیداوار اِن پیداواری قوتوں پر قابو پانے کی نا اہلیت کا مجرم بن جاتا ہے، اور دوسری جانب یہ پیداواری قوتیں موجود تضاد کو مٹانے کے لئے دباؤ ڈالتی ہیں تا کہ وہ اپنے آپ کو سرمایہ دارانہ ہیئت سے نجات دلائیں اور اپنے آپ کو اجتماعی پیداواری قوتیں تسلیم کروائیں۔

پیداواری قوتوں کا یہ دباؤ سرمایہ دار طبقے کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ تعلقات کی حدود میں پیداواری

قوتوں سے اجتماعی پیداواری قوتوں کا سا برتاؤ کرے۔ صنعتی گرم بازاری، قرضوں کی کثرت، بحران اور سرمایہ دار کمپنیوں کی تباہی ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت کی طرف لے جاتی ہے۔ اس اجتماعی ملکیت کا اظہار جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کی مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ اس قسم کے بہت سے ذرائع پیداوار اور ذرائع رسل و رسل جیسے ریلوے شروع ہی سے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ وہاں سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کا جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کے علاوہ اور کوئی دوسرا ذریعہ کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن ترقی کے چند مدارج طے کرنے کے بعد یہ ذریعہ بھی ناکافی ثابت ہوتا ہے چنانچہ ایک مخصوص ملک میں ایک مخصوص صنعت کی کسی شاخ میں پیداوار کی باقاعدگی کے لئے ٹرسٹ بنائے جاتے ہیں۔ ٹرسٹ میں شامل ہونے والے یہ طے کر لیتے ہیں کہ اس مخصوص صنعت کی مجموعی پیداوار کتنی ہو۔ اس کے بعد یہ لوگ پیداوار کی اس مقرر کردہ مقدار کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ اس طرح سے اجناس کا بھاؤ پہلے ہی سے مقرر ہو جاتا ہے لیکن جونہی کاروبار ماند پڑتا ہے، اس قسم کے ٹرسٹ عام طور سے ٹوٹ جاتے ہیں، چنانچہ سرمایہ دار اپنے تعاون اور باہمی اتحاد کے لئے کسی بڑی صورت کی تلاش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مخصوص انڈسٹری کے لئے ایک جوائنٹ اسٹاک کمپنی بنالی جاتی ہے۔ داخلی مسابقت کی جگہ ایک کمپنی کی اجارہ داری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ 1890 میں انگلستان میں الکلائی کی پیداوار کے ضمن میں ایسا ہی کیا گیا۔ الکلائی کے اڑتالیس بڑے بڑے کارخانے ایک کمپنی کے انتظام میں چلے گئے جس کا سرمایہ ساٹھ لاکھ پونڈ تھا۔

ٹرسٹوں میں مسابقت کی آزادی اپنی ضد یعنی اجارہ داری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مہاجنی سماج کی بے تدبیر پیداوار حملہ آور سوشلسٹ سماج کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اجارہ داری شروع شروع میں سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچاتی ہے لیکن اجارہ داری میں لوٹ کھسوٹ اس قدر واضح ہوتی ہے کہ وہ زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی۔ کوئی قوم پیداوار پر ٹرسٹوں کی نگرانی برداشت نہیں کر سکتی جس میں نفع بازوں کی ایک چھوٹی سی جماعت ساری قوم کو لوٹتی چلی جائے۔

بہر حال ٹرسٹ ہوں یا نہ ہوں مہاجنی سوسائٹی کی نمائندہ یعنی ریاست ایک نہ ایک دن پیداوار کی تنظیم کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ اس طرح سب سے پہلے رسل و رسائل کے بڑے بڑے ادارے یعنی ڈاکخانے، ٹیلیگراف اور ریلوے کو ریاست کی ملکیت میں تبدیل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

جہاں بحران نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ سرمایہ دار طبقہ نئی پیداواری قوتوں پر قابو رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا وہاں پیداوار اور رسل و رسائل کے بڑے بڑے اداروں کا جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں، ٹرسٹوں اور ریاستی ملکیت میں تبدیل ہو جانا ثابت کرتا ہے کہ سرمایہ دار طبقے کے بغیر بھی یہ مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ سرمایہ دار کے تمام کام اب تنخواہ دار ملازم کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ سرمایہ دار کا صرف یہ کام رہ گیا ہے کہ وہ منافع جمع کرتا چلا

جائے اور اسٹاک ایکسچینج میں جُوا کھیلے جہاں سرمایہ دار اپنے اپنے سرمایہ سے ایک دوسرے کی کھال اتارنے میں مصروف رہتے ہیں۔ جس طرح ابتدا میں سرمایہ دارانہ طریق پیداوار نے مزدوروں کو بیکار کر دیا تھا، اسی طرح یہی طریق پیداوار سرمایہ داروں کو صنعتی ریزرو فوج میں نہ سہی، آبادی کے غیر ضروری حصے میں ضرور شامل کر دیتا ہے۔

لیکن جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں، ٹرسٹوں اور ریاستی ملکیت میں تبدیل ہو جانے سے پیداواری قوتوں کی نوعیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ سرمایہ میں تبدیل نہیں ہوتیں۔ جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں اور ٹرسٹوں کے متعلق تو یہ بات بالکل واضح ہے۔ جدید ریاست بھی ایک ایسا ادارہ ہے جسے مہاجنی سماج سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کے عام خارجی حالات کو مزدوروں اور انفرادی سرمایہ داروں کی دستبُرد سے بچائے رکھتا ہے۔ جدید ریاست اپنی ہر شکل وصورت میں سرمایہ دارانہ مشین ہے۔ سرمایہ داروں کی ریاست -- تمام سرمایہ داروں کی ایک متحدہ عینی ریاست۔ یہ ریاست جتنا زیادہ پیداواری قوتوں پر قبضہ کرے گی، اتنا ہی یہ زیادہ سرمایہ داروں کا اجتماعی ادارہ بن جاتی ہے اور اتنا ہی وہ عام شہریوں کو زیادہ لوٹے گی۔ مزدور صرف اُجرتی مزدور رہتے ہیں یعنی پرولتاریہ، سرمایہ دارانہ تعلقات ختم نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنی انتہا تک پہنچ جاتے ہیں لیکن اس انتہا پر پہنچ کر یہ تعلقات آپ اپنی ضد بن جاتے ہیں۔ اس تضاد کا یہ حل نہیں ہے کہ پیداواری قوتوں پر ریاستی قبضہ ہو جائے۔ لیکن اس میں اس تضاد کے حل کی کلید تلاش کی جا سکتی ہے۔

یہ حل اسی وقت ممکن ہے جبکہ جدید پیداواری قوتوں کی اجتماعی ہیئت کو عملی طور سے مان لیا جائے اور جس طرح ذرائع پیداوار کی ہیئت اجتماعی ہو گئی ہے اسی طرح پیداوار، تصرف اور تبادلہ بھی اجتماعی ہونے چاہئیں۔ اس کا طریق کار صرف یہ ہے کہ سوسائٹی پس وپیش کئے بغیر اعلانیہ پیداواری قوتوں پر قبضہ کر لے جو اتنی ترقی کر چکی ہیں کہ پوری سوسائٹی کے علاوہ کوئی دوسرا اُنہیں قابو میں نہیں لا سکتا۔ اس طرح ذرائع پیداوار اور پیداوار کی اجتماعی ہیئت پر پیدا کنندگان کا ہوشمندانہ تصرف ہو جائے گا۔ اور اس طرح ذرائع پیداوار اور پیداوار کی اجتماعی ہیئت بدنظمی کی عِلت اور میعادی بحران سے بچ کر پیداوار کو بڑھانے کا سب سے طاقتور ذریعہ بن جائے گی۔ لیکن آج ذرائع پیداوار اور پیداوار کی اجتماعی ہیئت پیدا کنندگان کے لئے مصیبت بنی ہوئی ہے۔ جو وقتاً فوقتاً ذریعہ پیداوار اور تبادلے کو بیکار کر دیتی ہے اور جو فطرت کے اندھا دھند قوانین کی طرح متشدد اور تباہ کن ہے۔ جب تک ہم ان قوتوں کو، جو سوسائٹی میں اپنا کام کرتی رہتی ہیں، اچھی طرح سے نہیں سمجھ لیتے اور انہیں غیر ضروری خیال نہیں کرتے اس وقت تک یہ قوتیں بھی قدرت کی قوتوں کی طرح متشدد اور تباہ کن انداز میں اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ لیکن جونہی ہم ان کے رجحانات اور اثرات سے واقف ہو جاتے ہیں تو اس بات کا انحصار ہم پر ہوتا ہے کہ ہم ان قوتوں پر کیونکر بتدریج غالب آتے ہوئے ان سے اپنی منشا کے مطابق کام لیں۔ آج کل کی پیداواری قوتوں پر یہ بات پوری طرح

سے صادق آتی ہے۔ جب تک ہم ان قوتوں کی ہئیت اور فطرت کی آگاہی سے انکار کرتے رہیں گے۔(سرمایہ دارانہ طریق پیداوار اور اس کے حامی آگاہی حاصل کرنے کی کوشش میں حائل رہتے ہیں۔) اس وقت تک یہ قوتیں بہ ایں ہمہ ہماری مخالفت کرتی رہیں گی اور، جیسا کہ ہم ظاہر کر چکے ہیں، ان قوتوں کا ہم پر غلبہ رہے گا۔لیکن اگر ایک مرتبہ ہم نے ان کی اصل فطرت کو پا لیا تو پھر یہ دیو پیکر آقا ایک ساتھ مل کر کام کرنے والوں کے غلام بن جائیں گے۔بجلی وہ بھی ہے جو بادلوں کی گرج سے پیدا ہو کر تباہی مچاتی ہے اور وہ بھی بجلی ہے جسے مطیع کر کے رات کی تاریکی کو روشنی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات سمجھ لینے کے بعد اس امر کے لئے راستہ پیدا ہو جاتا ہے کہ پیداوار کے نراج کو دور کیا جائے اور اس کی جگہ ایک اجتماعی منصوبے کے مطابق پیداوار کا ایسا انتظام کیا جائے جس میں پوری سوسائٹی اور افراد کی ضرورتوں کا خیال رکھا جائے۔اس طرح سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کی جگہ جہاں پیداوار پہلے تو پیدا کنندوں اور پھر تصرف کرنے والے سرمایہ داروں کو غلام بنا لیتا ہے، پیداوار کی ملکیت کا ایک ایسا نظام رائج ہو جائے گا جس میں جدید پیداوار ایک طرف تو سوسائٹی کی ملکیت ہو گی جس کے ذریعہ پیداوار کو قائم رکھا اور بڑھایا جائے گا اور دوسری طرف یہ جدید پیداوار الگ الگ افراد کی ملکیت ہو گی جس سے وہ اپنی ضرورتیں پوری کر کے آرام سے زندگی بسر کر سکیں گے۔آبادی کی غالب اکثریت کو روزانہ اجرت پر کام کرنے والے مزدور (پرولتاریہ) بنا کر سرمایہ دارانہ طریق پیداوار ایک ایسی قوت کو پیدا کر دیتا ہے جو اپنے آپ کو تباہی سے بچانے کے لئے انقلاب برپا کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔اجتماعی پیداوار کے ذرائع کو ریاستی ملکیت میں تبدیل کر کے سرمایہ دارانہ طریق پیداوار خود بخود اس انقلاب کے لئے راستہ صاف کرتا ہے۔ پرولتاریہ ریاستی اقتدار پر قبضہ کر لیتا ہے اور سب سے پہلے ذرائع پیداوار کو ریاست کی ملکیت میں تبدیل کر دیتا ہے لیکن ایسا کرنے میں وہ اپنی پرولتاریہ حیثیت کو ختم کر دیتا ہے۔وہ تمام طبقاتی تنازعات اور امتیازات کو ختم کر دیتا ہے۔وہ ریاست کو بحیثیت ریاست بھی مٹا دیتا ہے۔ سابقہ سوسائٹی کو، جو طبقاتی نزاع کے دائرے میں گھومتی رہتی تھی، ریاست کی ضرورت رہتی تھی جو پیداوار کے خارجی کوائف کو برقرار رکھ سکے۔اس ادارے کی مدد سے لوٹے جانے والے طبقوں کو مظلومی کی کسی مخصوص حالت (غلامی، زرعی غلامی، اور اُجرتی محنت) میں مروجہ طریق پیداوار کے تحت زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ یہ ریاست سرکاری طور پر ساری سوسائٹی کی نمائندہ ہوتی تھی۔ یہ ریاست ساری سوسائٹی کی مرئی ہیئتِ اجتماعیہ کی تجسیم ہوتی تھی۔لیکن عملی صورت میں یہ ریاست اس مخصوص طبقے کی نمائندہ ہوتی تھی جو ایک مخصوص عہد میں ساری سوسائٹی کی نمائندگی کرتا تھا۔ازمنہ قدیم میں ریاست غلاموں کے مالک شہریوں کی نمائندہ تھی۔ازمنۂ وسطیٰ میں جاگیرداروں اور خود ہمارے زمانے میں یہ ریاست سرمایہ داروں کی نمائندہ ہے۔لیکن جب آخر کار یہ ساری سوسائٹی کی نمائندہ بن جاتی ہے تو پھر اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔سوسائٹی میں کوئی ایسا طبقہ ہی باقی نہیں

رہتا جسے محکوم بنا کر رکھا جائے۔طبقاتی غلبے کیجا تمکے ساتھ ہی پیداوار میں انارکی پر مبنی انفرادی کشمکش حیات اور اس انارکی سے پیدا ہونے والے سب جھگڑے اور سب زیادتیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ چونکہ کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہتی جس پر جبر کیا جا سکے اس لئے کسی مخصوص جبری قوت یعنی ریاست کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ریاست کا پہلا کام، جس میں وہ پوری سوسائٹی کی نمائندہ بن کر سامنے آتی ہے، سوسائٹی کے نام پر سارے ذرائعِ پیداوار پر قبضہ کرنا ہے لیکن بحیثیت ریاست یہ اس کی آخری خدمت ہے۔مجلسی تعلقات میں ریاستی اقتدار کی مدافعت یکے بعد دیگرے مختلف حلقوں میں بیکار ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔اشخاص کی حکومت کی جگہ اشیا کا نظم ونسق اور پیداوار کی جگہ نگرانی لے لیتی ہے۔ ریاست کو موقوف نہیں کیا گیا۔ بلکہ وہ خود بخود مرجھا گئی ہے۔اسی نقطہ نظر سے ہمیں آزاد عوامی ریاست کی اصطلاح کو پرکھنا چاہیے۔(گوتھا پروگرام نے مزدور جماعت کا مقصد ایک "آزاد عوامی ریاست" قائم کرنا قرار دیا تھا۔اس پر تنقید کرتے ہوئے اینگلز نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ ''آزاد عوامی ریاست'' ایک لغو اور بے معنی نعرہ ہے۔مزدور طبقہ ریاست سے جتنے دن بھی کام لیتا ہے، وہ آزادی کی خاطر نہیں، بلکہ اپنے دشمنوں کا سر کچلنے کے لئے اور جونہی آزادی کا مکان پیدا ہو جاتا ہے، ریاست کی حیثیت سے ریاست کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔اینگلز، خط بنام بیبل، مورخہ 18 مارچ 1875) یہ اصطلاح احتجاجی مقاصد کے لئے تو جائز ہے لیکن وہ سائنسی صحت سے خالی ہے۔اسی روشنی میں ہم نام نہاد انارکسٹوں کے اس مطالبے پر بھی غور کرنا چاہتے ہیں کہ چشم زدن میں ریاست کا خاتمہ کر دیا جائے۔(پرودھوں اور باکونین وغیرہ نراجیت پسند تھے۔لیکن وہ ریاست کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔انقلابی حکومت کی ضرورت اور اہمیت کے منکر تھے۔ فتح مند مزدور طبقہ اقتدار حکومت سے کیا انقلابی کام لے سکتا ہے، یہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ان کا مطالبہ تھا کہ ریاست چشم زدن میں مٹا دی جائے اور اس طرح مزدور طبقے کی آمریت کے خلاف انہوں نے ''نظریات'' گھڑے اور اب ان کے ماننے والوں نے عملی جدوجہد شروع کی۔) جب سے سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کا ظہور ہوا ہے اسی وقت سے بعض افراد اور جماعتوں کی طرف سے تمام ذرائع پیداوار کو سوسائٹی کی ملکیت بنائے جانے کے خواب دیکھے جا رہے ہیں۔لیکن ان خوابوں کی حقیقت خیالی خاکوں سے نہیں ہے۔ایسی سوسائٹی کا امکان، صرف اسی وقت تاریخی ضرورت بن جائے گا جبکہ ایسے مادی اسباب مہیا ہو جائیں گے جو اسے عملی جامہ پہنا سکیں گے۔سوسائٹی کی ترقی، انسانوں کے یہ محسوس کر لینے سے کہ مختلف طبقوں کا وجود انصاف اور آزادی کے خلاف ہے، ممکن نہیں ہو جاتی اور نہ اس کی ترقی کے لئے صرف اس ارادے کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان طبقوں کو موقوف کر دیا جائے۔سوسائٹی کی ترقی کا انحصار معاشی حالات پر ہوتا ہے۔آج سے قبل تک پیداوار کی پسماندگی اور سست رفتاری کا یہ تقاضا تھا کہ سوسائٹی میں دو طبقے ہوں، ایک لوٹنے والے اور دوسرا لٹنے والا، یعنی حکمران اور محکوم

طبقے۔ جب تک سوسائٹی کی غالب اکثریت کا تقریباً سارا وقت محنت پر صرف ہوتا رہا۔ اس وقت تک سوسائٹی کا طبقوں میں منقسم رہنا ضروری تھا۔ اس غالب اکثریت کے پہلو بہ پہلو جس کا سارا وقت محنت کرنے میں صرف ہوتا تھا، ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو پیداواری محنت سے آزاد تھا۔ یہی طبقہ سوسائٹی کے عمومی حالات، محنت کی تنظیم، ریاستی امور، عدل، سائنس، آرٹ اور دوسرے امور کی نگرانی کرتا تھا۔ تقسیمِ محنت ہی کا قانون طبقات کی تقسیم کی جڑ ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ طبقات کی اس تقسیم کی بنیاد تشدد، ڈکیتی، دھوکے اور فریب پر نہیں رکھی گئی۔ حکمران طبقہ غلبہ حاصل کرنے کے بعد مزدوروں کو نقصان پہنچا کر مجلسی نظم ونسق کو اس انداز میں ڈھالتا رہا ہے جس کے ذریعہ وہ عوام کو لوٹتا رہے۔

اگر ان اسباب کی بنا پر طبقات کی تقسیم کا جواز نکلتا ہے تو یہ جواز مخصوص سوشل حالات کے اندر ایک مخصوص وقت کے لئے تھا۔ اس کی بنیاد پیداوار کا ناکافی ہونا تھا۔ طبقات کی یہ تقسیم موجود ذرائع پیداوار کی ترقی کے سامنے ختم ہو جائے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ سوشل طبقات کو مٹانے کے لئے تاریخی ارتقا کے اس دور سے گزرنا ضروری ہے جہاں نہ صرف ایک مخصوص حکمران طبقے یا کسی قسم کی حکمران جماعت کا وجود یا طبقاتی امتیاز بیکار ہو جائے۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ پیداوار کی ترقی ایک ایسے مقام تک پہنچ جائے جہاں ذرائع پیداوار اور پیداوار کی ملکیت اور اس کے ساتھ ہی سوسائٹی کے ایک مخصوص طبقے کا سیاسی غلبہ، تعلیمی اجارہ داری اور ذہنی رہنمائی نہ صرف غیر ضروری ہو جائے بلکہ وہ معاشی، سیاسی اور ذہنی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جائے۔

اب ایسا مقام آ گیا ہے کہ سرمایہ داروں پر اپنا سیاسی اور ذہنی دیوالہ ظاہر ہو چکا ہے۔ ان کے معاشی دیوالیہ پن کا مظاہرہ ہر دس سال بعد ہوتا رہتا ہے۔ ہر بحران میں سوسائٹی خود اپنی پیداواری قوتوں اور پیداوار کے بوجھ تلے دب جاتی ہے۔ سوسائٹی ان سے کوئی کام نہیں لے سکتی۔ سوسائٹی بے بسی کے عالم میں اس تضاد کو دیکھتی رہتی ہے کہ پیدا کرنے والوں کے پاس صرف کرنے کے لئے اس بنا پر کچھ نہیں ہوتا کیونکہ صرف کرنے والے نہیں رہتے۔ ذرائع پیداوار کی پھیلتی ہوئی قوت ان زنجیروں کو توڑ دیتی ہے جو سرمایہ دارانہ طریق پیداوار نے انہیں پہنا رکھی ہیں۔ پیداواری قوتوں کی مسلسل، مستقل اور روز افزوں ترقی اور پیداوار کی لامحدود افزائش کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ان زنجیروں سے رہائی حاصل کی جائے۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ ذرائع پیداوار پر سوسائٹی کے قابض ہو جانے کے بعد نہ صرف پیداوار کی موجودہ مصنوعی پابندی دور ہو جائے گی بلکہ پیداوار اور پیداواری قوتیں ضائع ہونے سے بھی بچ جائیں گی جو آج کل پیداوار کے ساتھ چمٹی ہوئی ہیں اور جو بحران کی صورت میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہیں۔ ذرائع پیداوار پر سوسائٹی کا قبضہ ہو جانے کے بعد موجودہ حکمران جماعت اور اس کے سیاسی نمائندوں کی دیوانہ وار عشرتوں اور فضول خرچیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ امکان، کہ اجتماعی پیداوار کی بدولت سوسائٹی کا ہر فرد

ایسی زندگی بسر کرے کہ نہ صرف اس کی مادی ضروریات پوری ہوں بلکہ ایک ایسا ماحول بھی پیدا کیا جائے جس میں ہر فرد اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو پوری آزادی کے ساتھ ترقی دے سکے، پہلی مرتبہ پیدا ہوا ہے۔

جب ذرائع پیداوار پر سوسائٹی کا قبضہ ہو جاتا ہے تو پھر اجناسِ تبادلہ کی پیداوار بھی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی پیداوار کا دولت پیدا کرنے والوں پر غلبہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ سوشل پیداوار کی انارکی ختم ہو کر اس کی جگہ پیداوار کی ہوشمندانہ تنظیم شروع ہو جاتی ہے۔ انفرادی بقا کے لئے کش مکش بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس سطح پر پہنچ کر انسان ایک اعتبار سے حیوانی دنیا سے الگ ہو جاتا ہے اور حیوانی زندگی کے حالات کو ترک کر کے ایسے ماحول میں داخل ہوتا ہے جو حقیقی معنوں میں انسانی ہے۔ انسانی زندگی کا وہ ماحول جو اب تک اس پر غالب تھا، اب انسان کے غلبے تلے ہوگا۔ انسان زندگی پہلی مرتبہ فطرت کا باشعور آقا بنے گا کیونکہ وہ اپنی مجلسی تنظیم کا آقا بن چکا ہوگا۔ انسان کی مجلسی سرگرمیوں کے قانون جو اس وقت تک اسے خارجی معلوم ہوتے تھے اور جن کی حیثیت قوانین فطرت کے برابر خیال کی جاتی تھی اب انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوں گے۔ آئندہ ان قوانین پر انسان کا قبضہ ہوگا اور انسان مکمل تفہیم کے بعد ان قوانین کا اطلاق کرے گا۔ انسان کی اپنی مجلسی تنظیم جسے اب تک قدرت اور تاریخ کا فرمان خیال کیا جاتا تھا، انسان کا باہمی رضا کارانہ معاملہ بن جائے گی۔ وہ خارجی قوتیں جو اب تک تاریخ پر غالب تھیں، انسان کے اپنے تصرف میں چلی آئیں گی۔ صرف اسی مرحلہ پر پہنچ کر انسان اپنے پورے شعور کے ساتھ اپنی تاریخ خود بنائیں گے۔ صرف اسی مرحلہ پر پہنچ کر انسان کے حرکت میں لائے ہوئے مجلسی اسباب انسان کی اپنی مرضی کے مطابق نتائج پیدا کریں گے۔ انسان احتیاج کی دنیا سے نکل کر اختیار کی دنیا میں داخل ہو جائے گا۔

آخر میں ہم ارتقا کے سفر کے خاکے کو مختصر الفاظ میں یوں پیش کرتے ہیں۔

1۔ ازمنہ وسطی کی سوسائٹی: چھوٹے پیمانے پر انفرادی پیداوار۔ آلاتِ پیداوار چونکہ انفرادی استعمال کے لئے ہوتے تھے، اس لئے وہ بھدے، چھوٹے چھوٹے اور سست کام ہوتے تھے۔ پیداوار یا تو پیدا کنندہ کے لئے یا پھر اس کے جاگیردار آقا کے استعمال کے لئے ہوتی تھی۔ جب کبھی پیداوار استعمال سے زائد ہو جاتی تو اس زائد حصے کو بازار میں بیچنے کے لئے لایا جاتا۔ اس لئے جنسِ تبادلہ کی پیداوار اپنی ابتدائی منزل میں تھی لیکن اس منزل میں بھی سوشل پیداوار کی انارکی ادھوری صورت میں موجود تھی۔

2۔ سرمایہ دارانہ انقلاب: ۔ معمولی تعاون اور کارخانہ داری کی بدولت انڈسٹری میں تبدیلی۔ اُس وقت تک کے منتشر ذرائعِ پیداوار کا بڑے بڑے کارخانوں میں مجتمع ہونا۔ چنانچہ ذرائع پیداوار انفرادی کی جگہ اجتماعی بن جاتے ہیں لیکن یہ تبدیلی کسی طرح بھی تبادلے کے طریق کو متاثر نہیں کرتی۔ ملکیت اور تصرف کی پرانی صورتیں برقرار رہتی ہیں۔ سرمایہ دار ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ذرائع پیداوار کا مالک ہوتے ہوئے پیداوار پر قابض ہو کر پیداوار کو جنسِ تبادلہ بنا

دیتا ہے۔ پیداوار ایک اجتماعی عمل بن چکی ہے لیکن اس پر بھی تبادلہ اور تصرف انفرادی افعال رہتے ہیں، یعنی الگ الگ افراد کے افعال۔ اجتماعی پیداوار پر انفرادی سرمایہ دار کا قبضہ ہوجاتا ہے۔ یہی وہ بنیادی تضاد ہے جس سے وہ تمام دوسرے تضاد پیدا ہوتے ہیں جن میں موجود سوسائٹی حرکت کرتی ہے اور جنہیں جدید انڈسٹری ظاہر کرتی ہے۔

1۔ پیداکنندہ کا ذرائع پیداوار سے قطع حلائق۔ مزدور کو عُمر بھر اُجرتی محنت کی سزا۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں میں دشمنی۔

2۔ جنسِ تبادلہ پر حاوی قوانین کے اثر میں توسیع۔ بے عنان مسابقتی کشمکش، انفرادی کارخانے میں اجتماعی تنظیم اور پیداوار میں اجتماعی انارکی میں تضاد۔

3۔ ایک طرف تو مسابقت کی وجہ سے مشینوں کو بہتر بنانا انفرادی کارخانہ داروں کے لئے ایک جبری آئین بن گیا جس کے سبب مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تعداد بیکار ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہی صنعتی ریزرو فوج ہے اور دوسری طرف پیداوار کی غیر محدود توسیع بھی اسی طرح انفرادی کارخانہ داروں کے لئے مسابقت کا ایک جبری قانون بن جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں پیداواری قوتوں کی اَن سُنی ترقی، طلب سے زیادہ رسد، زائد پیداوار، منڈیوں میں اجناس کی بھرمار، ہر دس سال کے بعد بحران برائی کا چکر، ذرائع پیداوار اور پیداوار میں زیادتی، بیکار اور بھوکے مزدوروں کی زیادتی ہر طرف دکھائی دیتی ہے۔ لیکن پیداوار اور مجلسی بھلائی کے یہ دو پہلو ایک ساتھ کام کرنے کے لائق نہیں ہیں کیونکہ پیداوار کی سرمایہ دارانہ صورت پیداواری قوتوں کو کام کرنے سے روکتی ہے اور پیداوار کو گردش میں نہیں آنے دیتی جب تک کہ پہلے انہیں سرمایہ میں تبدیل نہیں کرلیا جاتا۔ خود ان کی افراط ہی ایسا کرنے میں رکاوٹ بنی رہتی ہے۔ تضاد بڑھ کر لغویت کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ یہ طریق پیداوار طرزِ تبادلہ سے مخاصمت میں ہے۔ سرمایہ داروں کو اس امر کا مجرم گردانا جاتا ہے کہ ان میں اپنی اجتماعی پیداواری قوتوں کے نظم ونسق کی صلاحیت نہیں رہی۔

4۔ سرمایہ داروں کو خود بخود پیداواری قوتوں کی جزوی اجتماعی ہیئت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ پیداوار اور نقل وحرکت کے بڑے بڑے ادارے، پہلے جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں پھر ٹرسٹوں اور آخرکار ریاست کے حوالے کردیئے جاتے ہیں۔ سرمایہ دار ایک 'بیکار طبقہ' ہوکر رہ جاتے ہیں۔ اس کے تمام مجلسی فرائض ان کے اجیر ملازم سرانجام دیتے ہیں۔

4۔ پرولتاری انقلاب: تضاد کا حل۔ مزدور طبقہ ریاستی اقتدار پر قابض ہوجاتا ہے اور اس اقتدار کی مدد سے اجتماعی ذرائع پیداوار کو، جو سرمایہ داروں کے ہاتھ سے نکلتے جارہے تھے، عوامی ملکیت بنادیتا ہے۔ ایسا کرنے سے مزدور طبقے نے ذرائعِ پیداوار کو سرمائے کی خصوصیات سے، جن کے وہ اب تک حامل تھے، آزاد کردیا۔ مزدور طبقہ ذرائع پیداوار کی اجتماعی ہئیت کو ترقی کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اب اجتماعی پیداوار کسی باقاعدہ منصوبے کے تحت ہوجاتی

ہے۔ پیداوار کی ترقی کی وجہ سے سوسائٹی میں مختلف طبقات کا وجود سہوِ زمانی بن جاتا ہے۔ جوں جوں اجتماعی پیداوار کی انارکی دور ہوتی جاتی ہے، اسی نسبت سے ریاست کا سیاسی اقتدار بھی ختم ہوتا چلا جاتا ہے۔انسان آخرکار اپنی مجلسی تنظیم کا آپ آقا بن جاتا ہے۔اس کے ساتھ ہی فطرت پر بھی اس کا غلبہ قائم ہوجاتا ہے۔انسان اپنا مالک آپ بن جاتا ہے___ آزاد۔

دنیا کو آزاد کرانے کا کام جدید مزدور طبقے کا تاریخی مشن ہے۔سائنسی سوشلزم کو، جو مزدور تحریک کا نظریاتی اظہار ہے، اس کام کے لئے تاریخی حالات پیدا کرنا ہیں۔مزدور طبقے کو، جو اب پِسا ہوا ہے، اُس کام سے آگاہ کرنا ہے جس کی تکمیل اُس کی تقدیر میں لکھی ہوئی ہے!

فرہنگ

پیش لفظ

سائنس میں ہرایوگن دوہرنگ کا انقلاب۔ فریڈرک اینگلز کی یہ کتاب 'قاطع دوہرنگ' کے نام سے مشہور ہے، جس کا علمی پایہ 'سرمایہ' کے برابر ہے۔

لیپزگ۔جرمنی کا مشہور شہر جہاں نپولین کے خلاف 'جنگِ اقوام' لڑی گئی تھی۔

پال لفارگ۔فرانس کا ایک کمیونسٹ لیڈر جس نے پہلی کمیونسٹ انٹرنیشنل کے قیام میں کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کا ہاتھ بٹایا تھا۔

پولستانی۔پولینڈ سے متعلق

زیورچ۔سوئٹزرلینڈ کا ایک شہر جہاں سے 'سوزیال دیموکرات' شائع ہوتا تھا۔

لسال۔جرمنی کی مزدور تحریک کا ایک نمایاں لیڈر جس نے جرمنی کے مزدوروں کی سیاسی تنظیم کی۔لیکن آخرکار وہ جرمنی کے وزیراعظم بسمارک کا ہم خیال ہوگیا۔

وان کوئی ہوتDon Quixote۔ہسپانوی ادیب سرونٹیز کے اسی نام کے ایک ناول کا ہیرو۔جو اس عہد کے بانکوں کی نمائندگی کرتا ہوا عجیب وغریب حماقتوں کا ثبوت دیتا ہے۔سروانتیس کا یہ ناول یورپ کی جاگیردارانہ

سوسائٹی پر ایک طنز ہے۔

سانچو پانزا۔Sancho Panzaوان کوئی ہوت کا ایک سیانا مصاحب۔

کانٹ۔ جرمنی کا ایک نامور فلسفی (1724-1804) کانٹ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اس کی آنکھیں روسو کی لکھی ہوئی کتابوں نے کھولیں۔ کانٹ جہاں کہیں سیاسی فلسفے پر بحث کرتا ہے وہاں وہ کوئی نئے خیالات پیش نہیں کرتا بلکہ روسو کے نظریوں کو اپنے نظامِ فلسفہ میں سمو دیتا ہے۔ کانٹ بھی ان لوگوں میں سے تھا جو انقلابِ فرانس کی زیادتیوں سے ڈر گئے تھے۔ ان زیادتیوں نے اس کی نظر میں انقلابِ فرانس کی اہمیت کو کسی طرح کم نہیں کیا تھا۔ کانٹ کے سیاسی نظریئے اس کے اخلاقی فلسفے کا ایک جزو ہیں۔ اس کے نزدیک سیاسی زندگی کو اخلاقیات کے ماتحت ہونا چاہیے کیونکہ اصولاً اخلاقی اور سیاسی معیار میں کوئی فرق نہیں ہوسکتا اور عمل میں کبھی فرق پیدا بھی ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عمل عقلِ محض کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ افلاطون کی طرح کانٹ بھی اخلاق کو سیاسی تخیل کا رہبر بناتا ہے۔ اس کے نزدیک نظریوں کی عملی قدر و قیمت اخلاقی فرض کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اخلاقی فرض کیا ہے تو پھر اس سے سیاسی اصول اخذ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیئے۔ کانٹ کی نظر میں ریاست کی بذات خود کوئی خاص فلسفیانہ اہمیت نہیں۔ اس کا فلسفہ انفرادی اخلاق سے شروع ہو کر بین الاقوامی اخلاق پر ختم ہوتا ہے۔ سیاسی زندگی کا جو پہلو اخلاق کے دائرے میں نہیں اُسے وہ اپنی بحث سے خارج کر دیتا ہے۔ کانٹ کا بنیادی مسئلہ، جس کی طرف روسو نے اُسے توجہ دلائی، انسان اور انسانی آزادی کی اخلاقی قدر ہے۔ اس کی سیاسی تعلیم اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کا ایک ضمنی نتیجہ ہے کہ انسان کی اخلاقی آزادی اور اس جبر میں کس طرح مصالحت کی جائے جو سیاسی معاشرے میں اس پر کیا جاتا ہے۔ انسان کا واحد قدیم حق، جو اسے بحیثیتِ انسان ملنا چاہیئے، آزادی ہے۔ ہر وہ فعل اِس حق کی رو سے جائز ٹھہرتا ہے جس کی وجہ سے کسی ایک شخص کی آزادی اور تمام دوسرے لوگوں کی آزادی کے پہلو بہ پہلو رہنے میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ کانٹ انفرادیت کے فنا ہو جانے کو تسلیم نہیں کرتا اور اُس کا یاپلٹ کا بھی نہیں قائل نہیں جو روسو کے نزدیک 'معاہدۂ اجتماعی' کے ذریعے انسان کی اخلاقی سرشت بدل دیتی ہے۔ کانٹ کا یہ خیال ہے کہ معاہدۂ اجتماعی سے پہلے انسان آزاد اور خود مختار نہیں تھے بلکہ اجتماعی زندگی ناململ شکل میں موجود تھی جسے معاہدۂ اجتماعی نے تکمیل کو پہنچایا۔ اس سے بظاہر تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کانٹ معاہدۂ اجتماعی کو ایک تاریخی واقعہ فرض کرتا ہے۔ لیکن کانٹ کی اس کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں تھی۔ کہیں تو وہ اجتماعی معاہدے کو رد کر دیتا ہے، کہیں اسے لازمی اور کہیں اسے محض عینی تصور ٹھہراتا ہے۔ دراصل اسے اس مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ایک مقام پر کہا ہے کہ ریاست کے آغاز پر بحث کرنا فضول اور خطرناک ہے۔ معاہدۂ اجتماعی کو اس نے محض ایک مروجہ اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے اور جب کبھی وہ محسوس کرتا ہے کہ معاہدے کا

تصور اس کے سلسلہِ خیالات میں نہیں کھپتا تو وہ اسے بلا تامل رَد کر دیتا ہے جس کے سبب اس کے خالص سیاسی نظریوں میں تناقص پیدا ہو جاتا ہے۔ اسے قومی ریاست کی اجتماعی زندگی اور اس کے اعلیٰ اِمکانات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسی وجہ سے اس نے ان تمام مسائل کو نظر انداز کر دیا ہے جن کا تعلق صرف ریاست سے ہے۔ اس لحاظ سے اس کا خالص سیاسی فلسفہ بہت کمزور ہے۔ (تاریخِ فلسفہِ سیاسیات سے ماخوذ) لینن کے الفاظ میں جب کانٹ یہ کہتا ہے کہ شے بالذات' ہمارے ادراک سے مطابقت رکھتی ہے، تو وہ مادیت پسند دکھائی دیتا ہے لیکن جب وہ یہ کہتا ہے کہ شے بالذات' ادراک کی حد سے پرے ہے اور ہمیں نہ اس کا علم ہو سکتا ہے اور نہ تجربہ تو وہ عینیت پسند معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کانٹ کے اس تناقص پر بہت سے فلسفی اعتراض کرتے ہیں۔

لاپلاس۔ لاپلاس (1749-1827) فرانس کا ایک مشہور ماہر فلکیات جس نے طبیعات میں بھی بڑا نام پیدا کیا تھا۔

ڈارون کا نظریہِ آفرینش۔ کائنات کو وجود میں لانے یا اس کے وجود میں آنے سے متعلق نظریہ چارلس ڈارون (1809-1882) اپنے نظریہ ارتقا کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اس نے یہ ثابت کیا تھا کہ نامیاتی اجسام بدلتے رہتے ہیں۔ جو اجسام اس تبدیلی کی صلاحیت کو کھو دیتے ہیں، وہ فنا ہو جاتے ہیں۔ ڈارون اپنے نظریہ ارتقا کی تشریح آغازِ انواع میں کرتا ہے۔ کارل مارکس نے آغازِ انواع کا مطالعہ کرنے کے بعد فریڈرک اینگلز کو لکھا تھا کہ ڈارون کی تحقیق سے ہمارے جدلیاتی نظریہ کی تائید ہوتی ہے

ہیگل۔ ہیگل (1770-1831) جرمنی کا ایک مشہور فلسفی جس نے جدلیات کو عینیت کے اصولوں کے مطابق انسانی تاریخ پر منطبق کیا۔

جدلیات۔ یونانی فلسفہ کی اصطلاح Dialectes کا ترجمہ۔ جدلیات سے مراد وہ تضاد ہے جو ہر شے میں موجود رہتا ہے اور جس سے ہر چھوٹی بڑی چیز عالمِ وجود میں آتی اور فنا ہوتی رہتی ہے۔

تاریخ کا مادی نظریہ۔ تاریخ کے اس نظریے سے یہ مراد ہے کہ پیداوار اور پیداوار کی اجناس کا تبادلہ ہر سوشل نظام کی بنیاد ہے۔ انسانی تاریخ میں جو سوسائٹی بھی پائی جاتی ہے اس میں پیداوار کی تقسیم اور طبقہ بندی کا انحصار اس بات پر رہا ہے کہ سوسائٹی کیا پیدا کرتی ہے، کیسے پیدا کرتی ہے اور اس میں پیداوار کی تقسیم کس طرح ہوتی ہے۔ تاریخ کے اس نظریے کے مطابق تمام سوشل تبدیلیوں اور سیاسی انقلابوں کے بنیادی اسباب کو طریقِ پیداوار اور تبادلہ کی تبدیلیوں میں دیکھنا چاہئے (متن میں سے)

فطشے۔ ایک جرمن فلسفی (1764-1816) جو اپنی پہلی تصنیف میں روسو اور کانٹ کا پیرو، انفرادیت کا حامی اور ریاست کا کھلا مخالف معلوم ہوتا ہے۔ دوسری تصنیف میں اپنا نکتہِ نظر بدلے بغیر وہ ریاست کے دائرے کو کسی قدر

وسیع کرتا ہے اور تیسری تصنیف میں، جس کا موضوع دراصل معاشی مسائل ہیں، وہ ریاست کے فرائض میں اتنے اضافے کر دیتا ہے کہ انفرادیت کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔ فطشے کی اس کتاب کو شائع ہوئے چھ سات سال گزرے تھے کہ نپولین نے جرمنی پر حملہ کیا۔ فطشے نے لیکچروں اور تقریروں کے ذریعہ سے قوم میں اپنی تہذیب کی قدر پیدا کرنے کی پوری کوشش کی۔ تہذیب کی قدر نے فطشے کے دل سے اس انفرادیت کی یاد بالکل محو کر دی جس کا وہ پہلے گرویدہ تھا۔ اس نے لیکچروں اور تقریروں میں جو نئے نظریے قائم کئے وہ اس کی آخری تصنیف میں باقاعدہ سیاسی فلسفے کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ اس کی پہلی اور آخری تصنیف سے زیادہ متضاد خیالات مخالف فلسفیوں کی تصانیف میں بھی شاید ہی ملیں گے۔ اس کے فلسفہ پر سیاسی واقعات کا اثر پڑتا رہا۔ اسے کانٹ کی طرح فلسفیانہ تصورات میں ڈوبا رہنا منظور نہ تھا۔ اس نے کانٹ کی طرح یہ نہیں کیا کہ مجرد اصولوں کے سوا حقیقت معلوم کرنے کے دوسرے تمام ذرائع کو اپنی بحث سے خارج کر دیتا۔ اسے ایسے عقیدوں کی تلاش تھی جن پر سیاسی حوصلوں کی بنیاد رکھی جاسکے۔ شروع میں، جب وہ انفرادیت کا قائل تھا، اس نے ریاست کے سپرد ایسا فرض کیا جس کے مقابلے میں دیگر تمام فرائض محض نمائشی ہیں۔ اور آخر میں جب وہ ریاست کا پرستار بن گیا تو اس نے افراد کے ذمے ایسے فرائض ڈالے جن کے بغیر ریاست ایک مردہ جسم بن کر رہ جاتی ہے۔ فطشے کے آخری دور کے فلسفے میں ایک حد تک تنگ نظری ضرور تھی کیونکہ اس نے صرف جرمن قوم کو مخاطب کرتے ہوئے اسے یقین دلایا تھا کہ اس میں خاص اوصاف ہیں جو اسے خدا کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔

پہلا باب

سوسائٹی۔ سماج معاشرہ

نظریاتی۔ نظریہ سے متعلق

ہیگل۔ ہیگل (1770-1831) پہلا فلسفی ہے جس کی بحث میں ریاست واقعی ایک جسم نامی ٹھہرائی گئی ہے۔ اس نے اپنے پیش روؤں کی طرح سیاسی نظام کا واحدہ (اکائی) فرد کو نہیں مانا بلکہ ریاست کو ہیگل نے اس عقل کی، جسے فلسفی افراد کی خصوصیت سمجھتے آئے تھے، ایک نئی تشریح کی اور اُس فرضی ذہنی معیار کو، جس کے مطابق قانون وفطرت کے ضابطے یا معاہدۂ اجتماعی کی شرائط طے کی جاتی تھیں، ایک نئی شکل دے دی۔

ہیگل کے سیاسی نظریے اس کے پورے فلسفے کا ایک حصہ ہیں اور انہیں صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اس کے عام فلسفیانہ عقائد کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ اس کی بنیاد ارتقا ہے، لیکن ارتقا کا جو مفہوم اس نے قائم کیا ہے اسے حیاتیات

کے علمی اصول سے بہت کم تعلق ہے۔ حیاتیاتی اصول کے مطابق ذہن کا پیدا ہونا اور زندگی پر اثر ڈالنا ترقی کا انتہائی درجہ ہے۔لیکن اس کے برخلاف ہیگل کے نزدیک ارتقا کوئی مادی یا میکانکی سلسلہ نہیں بلکہ ایک ذہنی اور روحانی قانون ہے اور اس کے عمل میں آنے کے معنی یہ ہیں کہ ذہن اپنے مادی ماحول کو ایک مقصد یا عینی تصور کے حصول کے لئے بتدریج ترقی دیتا رہا۔ہیگل عقل کو ایک فرضی اور مستقل ذہنی قوت نہیں سمجھتا اور اس مقصد کو، جو ارتقا کا محرک ہو، انسان کے ماحول سے جُدا چیز نہیں ٹھہراتا۔ انسانی عقل بھی نشو ونما پاتی ہے اور اس کے ساتھ وہ تصور بھی جسے انسان اپنے ماحول میں مجسم کر کے دکھانا چاہتا ہے۔ روح اور مادے، عقل اور اس کے میدانِ عمل کو ایک دوسرے فطرتاً جدا نہ تصور کرنا چاہیے۔انسان کا سارا علم اور تجربہ ایک ذخیرہ ہے جسے عقل نے جمع کیا ہے اور عقل ہی وہ قوت ہے جو خود نشو ونما پاتی ہے اور اپنی تخلیق کو، جو اس کا میدانِ عمل بھی ہے اور مجسّم مظہر بھی، نشو ونما دیتی رہتی ہے۔ ارتقا کا اصول بھی ہیگل کے سیاسی تخیل کی رہبری کرتا ہے۔ اگر اس کی تعبیر سیاسی اصطلاح میں کی جائے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اجتماعی زندگی کے تمام مظاہر انسانی عقل کی تخلیق ہیں اور ایک تصور کے مجسّم مظاہر، یعنی وہ سیاسی نظام اور ادارے جو کسی زمانے میں موجود ہوں، ذہنی تصور کا تقاضا پورا نہیں کرتے یا اس کا حق ادا نہیں کر سکتے اور عقل کی تحریک سے تصور کے مجسمے اپنی شکل بدلتے اور ترقی کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح ہیگل بظاہر سیاسیات کو تاریخ کا پابند کر دیتا ہے مگر یہ پابندی غلامی نہیں ہے۔ تاریخ کی اہمیت کے باوجود ہیگل کا اصرار ہے کہ اصل چیز سیاسی دنیا کے مظاہر نہیں ہیں بلکہ وہ تصور، وہ عینی مقصد ہے جسے حاصل کرنے کی غرض سے یہ مظاہر وجود میں آتے ہیں۔ اس طرح ہم تصور کو اس شکل سے جدا نہیں کر سکتے جو اس نے کسی وقت میں اختیار کی ہو۔لیکن اصل چیز تصور ہے اس کی شکل نہیں۔ ہیگل افراد کے حق میں بہتر سمجھتا ہے کہ وہ ریاست کو اپنی نشو ونما کا اصل ذریعہ جانیں اور ریاست کے لئے ضروری سمجھتا ہے کہ وہ افراد کی نشو ونما کو اپنے ارتقا کا حقیقی وسیلہ قرار دے۔

روسو۔ژاں ژاک روسو۔(1712-1778) انقلابِ فرانس کا بہت بڑا نقیب اور ایک نامور آوارہ ادیب۔ ایک گھڑی ساز کا بیٹا تھا۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کا آوارہ باپ اسے چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا۔ روسو کے عزیزوں نے اسے ایک سنگ تراش کے پاس کام سیکھنے کے لئے بھیج دیا۔ استاد بہت زیادہ تند مزاج تھا۔ شاگرد کے لئے یہ تندی ناقابل برداشت تھی۔ سولہ سال کی عمر میں وہ آوارہ گردی کے لئے گھر سے نکل پڑا۔ مرتے دم تک وہ آوارہ ہی رہا۔ اسے کوئی مستقل ٹھکانہ نہ مل سکا۔ اس نے عمر بھر کوئی خاص پیشہ اختیار نہ کیا۔ اس کی ساری زندگی دکھوں سے بھری پڑی ہے۔ روسو کی آوارگی اس کے ذہن کی جِلا کا سبب بنی۔ شائد ہی کوئی ایسی ذلت تھی جس سے روسو نے اپنے آپ کو وابستہ نہ کیا ہو۔لیکن ذلت ورسوائی میں بھی اس کا سینہ ایک بے پناہ طوفان کو تھامے ہوئے تھا۔ 38 برس کی عمر میں جب اس نے قلم اٹھایا تو یہ طوفان جذبات کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اُس کے پہلے مقالے نے فرانس بھر میں

ہیجان پیدا کر دیا۔کل کا آوارہ آج کا ادیب بن گیا۔اس کے خیالات نے فرانس کو ہلا دیا۔عبرت ناک زندگی بسر کرنے والا سوسائٹی کے لئے اخلاقی معیار تجویز کرتا ہے۔اپنے بچوں کو یتیم خانے کے سپرد کرنے والا بچوں کی تعلیم وتربیت پر کتاب لکھتا ہے۔

معاہدۂ عمرانی۔روسو کی سب سے مکمل کتاب معاہدۂ عمرانی ہے۔اس کتاب کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن افسوس کہ وہ ہر جگہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ان الفاظ سے معاہدۂ عمرانی کا آغاز ہوتا ہے۔روسو کے خیال میں سوسائٹی اور ریاست آزاد انسانوں کے باہمی معاہدے سے پیدا ہوئی تھیں لیکن ایک مدت گزرنے کے بعد اس ریاست میں مساوات قائم نہ رہی۔اب اگر انسان پھر کوشش کرے تو اُسی معاہدے کی بنا پر سوسائٹی میں آزادی اور مساوات قائم کی جا سکتی ہے۔روسو کے تخیل کا اعجاز ہے کہ ایک افسانہ،جس سے انسان زیادہ سے زیادہ اپنا جی بہلا سکتا تھا،ایک ہمت افزا حقیقت بن گیا۔لیکن یہ خواب کی باتیں،خواہ وہ علم سے برتر مرتبہ رکھتی ہوں،علم کی تعریف میں نہیں آسکتیں اور عملی اخلاق پر ایسی خیال آرائیوں کا چاہے جتنا اچھا اثر پڑے،ہم انہیں اخلاقیات میں شامل نہیں کر سکتے اس لئے کہ ان میں عقل اور منطق کو ذرا بھی دخل نہیں۔روسو کی تعلیم کا کسی علم سے تعلق نہیں۔عالم کے لئے جو ذہنی خصوصیات لازمی ہیں ان میں سے ایک بھی اُس میں موجود نہ تھی۔اس نے مطالعے کے ذریعے سے جو تھوڑی بہت معلومات حاصل کی تھیں۔انہیں ہم مروتاً بھی علم قرار نہیں دے سکتے۔

پرولتاریہ۔مزدوروں کا وہ طبقہ جس کی ملکیت قوتِ محنت کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

گِلڈ۔ہم پیشہ لوگوں کی انجمن

تحریکِ اصلاح۔سولھویں صدی کے یورپ کی وہ مذہبی اور سیاسی تحریک جس کا خاتمہ پروٹسٹنٹ کلیساؤں کے قیام پر ہوا۔اس تحریک کے اسباب کو سمجھنے کے لئے رومن کیتھولک چرچ کی تشکیل اور ہیئت کا مطالعہ ضروری ہے۔یورپ کے حکمرانوں اور پاپاؤں میں تقسیمِ اقتدار کی جدوجہد نے اس تحریک کو ازمنہ وسطیٰ ہی میں جنم دے دیا تھا لیکن اس تحریک نے زور سولھویں صدی میں پکڑا۔1517 میں مارٹن لوتھر نے وٹن برگ کے کلیسا کے دروازے پر کلیسا کے خلاف 95 نکات پر مشتمل ایک مضمون آویزاں کیا۔پوپ نے اسے کلیسا سے خارج قرار دے دیا۔ مارٹن لوتھر کے پیرو 'پروٹسٹنٹ' کہلاتے ہیں۔ابتدائی دور کا ہر پروٹسٹنٹ لوتھرین نہیں تھا۔سوئٹزر لینڈ میں زونگلی جبکہ کالوین کی تحریک فرانس،ہالینڈ اور اسکاٹ لینڈ میں پھیل گئی۔

لیولرز۔انگلستان کی ایک سیاسی جماعت جو خانہ جنگی کے دوران پیدا ہوئی۔کرامویل کی فوج کے سپاہی زیادہ تر اس پارٹی کے ممبر تھے۔اس پارٹی کا لیڈر جان لطبرن تھا۔اس پارٹی نے اپنے جمہوری اصولوں کو میثاقِ عوام میں پیش کیا تھا۔1649 کے بعد اس پارٹی نے بغاوت کر دی۔لیکن ان کی بغاوت پر بہت جلد قابو پا لیا گیا۔1660 میں اس

پارٹی کا خاتمہ ہوگیا۔

انقلابِ فرانس ۔ 1789 میں فرانس میں جو انقلاب ہوا اُس نے سارے یورپ کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ فرانس کے عوام پر ٹیکسوں کا بہت زیادہ بار تھا۔ نظم ونسق میں بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ انقلاب کے ان اسباب کے ساتھ ساتھ فرانس کے فلسفیوں کی تحریروں نے پڑھے لکھے لوگوں کو انقلاب کے لئے تیار کرلیا۔ 1614 کے بعد 1789 میں فرانس کی سٹیٹس جنرل کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس کے دوران فرانس کے تیسرے طبقے کے نمائندوں نے مل کر قومی اسمبلی قائم کر لی۔ چودہ جولائی 1789 کو انقلابیوں نے باستئل کی جیل کو توڑ دیا۔ ترنگے پھریرے کو قومی پرچم بنالیا گیا۔ قومی اسمبلی نے تمام مراعات کو ختم کر کے ایک نیا دستور مرتب کرنے کا اعلان کر دیا۔ اسی اثنا میں فرانس کے کئی امراء دوسرے ملکوں کو بھاگ گئے ۔ جون 1791 میں بادشاہ نے بھی بھاگنے کی کوشش کی لیکن پکڑا گیا۔ یورپ کے دوسرے حکمرانوں نے فرانس کے معاملات میں دخل دینا چاہا لیکن جیکو بن پارٹی نے اُن کی ایک نہ سُنی ۔ مارچ 1792 میں فرانس نے آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ پروشیا نے آسٹریا کی مدد کرنا چاہی لیکن فرانسیسی فوج نے پروشیا کی فوج کو شکست دی ۔ اب قومی کنونشن قائم ہو چکی تھی ۔ انتہا پسندوں کا غلبہ تھا۔ 1793 کو فرانس کی جمہوریت نے لوئی کو موت سزا دی۔ فرانس کی جمہوریت نے اعلان کر دیا کہ وہ یورپ کے ہر اُس ملک کی مدد کرے گی جو بادشاہت کو ختم کرنا چاہتا ہو۔ 1793 میں تحفظ عامہ کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کمیٹی کی سب سے سرگرم اور نمایاں شخصیت ارابس پیئر تھی۔ اب دہشت پسندی کا دور شروع ہوا۔ یہ دور اکتوبر 1795 تک قائم رہا جبکہ نظامت قائم کی گئی۔ نظامت کے قائم ہوتے ہی انقلاب فرانس کا دور ختم ہو جاتا ہے!

بابوف ۔ فرانس کا ایک سیاستدان ۔ جب فرانس میں انقلابِ فرانس ہوا تو اس وقت بابوف کسی دفتر میں مُنشی تھا۔ وہ بہت جلد اِس تحریک کا لیڈر بن گیا۔ اُس نے اپنے اخبار میں رابس پیئر کی مخالفت کی ۔ 1794 میں، جبکہ پیرس کو مصائب کا سامنا تھا، اس نے ایک نیا نظام پیش کیا۔ اسے 27 مئی 1797 کو قتل کر دیا گیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے کمیونسٹ گروہوں کی سازشوں اور بغاوتوں کے ذریعہ سے کمیونزم کے قیام کا خواب دیکھتا تھا۔

مثالی معاشرت ۔ سولہویں اور سترھویں صدی کے ان خیالی سوشلسٹوں کی طرف اشارہ ہے جو ایک ایسی سوسائٹی کے خواب دیکھتے تھے جس میں ذاتی ملکیت نہ ہو۔ ان خیالی سوشلسٹوں میں تھامس مور اور کیمپا نیلا خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

راہبانہ کمیونزم ۔ ایسا کمیونزم جو سوسائٹی کی تشکیل پر سائنسی غور وفکر کرنے کی نسبت انسانوں سے ہر قسم کی لذت ترک کروا کر انہیں راہبوں میں تبدیل کر دے۔

اسپارٹا ۔ پرانے یونان کی ایک شہری ریاست جہاں ہر شہری کو فوجی تعلیم دی جاتی تھی اور جہاں ’ریاست کی خدمت‘ کا

جذبہ تمام دوسرے جذبات پر غالب تھا۔ اسپارٹا نے جنگِ یونان و ایران میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ پیلو پونیشی جنگ میں اسپارٹا نے ایتھنز کو شکست دی تھی لیکن بہت جلد ایتھنز کی شہری ریاست نے اسپارٹا کو شکست دے دی۔ ''اسپارٹی زندگی'' سے مراد سادہ اور بہادرانہ زندگی ہے۔

بورژوائی۔ سرمایہ دارانہ طبقہ، ذرائعِ پیداوار پر قابض۔

عہدِ خطر۔ 94-1793 میں فرانس کی انقلابی حکومت کی عنان جیکو بن پارٹی کے ہاتھ میں تھی۔ یہ پارٹی چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں اور محنت کرنے والوں کی نمائندہ تھی۔ اس پارٹی نے انقلاب کے مخالفوں کو ختم کرنے کے لئے دہشت انگیزی اور قتال کو اختیار کیا۔

نظامت۔ عہدِ خطر کے زوال کے بعد فرانس میں ناظموں کی جو حکومت قائم ہوئی وہ فرانس کی تاریخ میں نظامت کہلاتی ہے۔ نپولین نے اِس نظامت کو ختم کر دیا۔

نپولین۔ پندرہ اگست 1769 کو پیدا ہوا۔ جب فرانسیسی جمہوریت کی فوج نے 1894 میں اٹلی پر حملہ کیا تھا تو نپولین اِس فوج کا کمانڈر تھا۔ اُس کی فتوحات نے اُسے فرانس میں بہت زیادہ مقبول بنا دیا۔ 9 نومبر 1799 کو نپولین نے فوجی ہلہ بول کر ایک نئے دستور کے تحت حکمرانی کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ اٹلی میں ایک مرتبہ پھر کامیابی حاصل کرنے کے بعد 1804 میں وہ فرانس کا شہنشاہ بن گیا۔ داخلی لحاظ سے فرانس اب تک خود مختار حکمران کے ماتحت تھا۔ خارجی لحاظ سے فرانس کی فوجیں یورپی ملکوں سے لڑنے میں مصروف تھیں۔ 1812 میں اُس نے روس پر حملہ کیا۔ اس حملے میں وہ تباہ ہو گیا۔ لیپزگ کی لڑائی میں اتحادیوں نے اُسے شکست دی اور اسے البا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ 26 فروری 1815 کو اُس نے آخری مرتبہ تقدیر آزمائی کی۔ وہ البا سے بھاگ کر فرانس پہنچ گیا۔ پندرہ جون 1815 کو اُس نے واٹرلو میں شکست کھائی۔ اس نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اسے سینٹ ہلینا کے جزیرے میں جلاوطن کر دیا گیا۔ جہاں اس نے 5 جون 1821 کو وفات پائی۔

کارلائل۔ برطانیہ کا مشہور مورخ کارلائل 1795 میں پیدا ہوا۔ اُس نے اپنی زندگی کا آغاز سکول ماسٹر کی حیثیت سے کیا۔ 1834 میں وہ لندن میں مقیم ہو گیا۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں 'ہیرو پرستی' اور 'انقلابِ فرانس' بہت مشہور ہیں۔ جس مکان میں کارلائل رہتا تھا اسے میوزیم میں تبدیل کیا جا چکا ہے۔

اخوت۔ بھائی چارہ

قانونِ مساکین۔ انگلستان میں قانونِ مساکین کسی نہ کسی صورت میں ملکہ الزبتھ کے وقت سے چلا آ رہا ہے 1834 میں اس قانون میں بہت سی ترامیم کی گئیں۔ آخری مرتبہ اس قانون میں 1930 میں ترمیم کی گئی۔

پرودھوں۔فرانس کا ایک مفکر(1809-1865) جو اَنارکزم کا بانی کہلاتا ہے۔وہ جس سوشل نظام کی تعلیم دیتا ہے اس کی بنیاد چھوٹے کاشتکار اور آزاد مزدوروں کی آزاد محنت پر ہے۔

ویت لنگ۔جرمنی کا ایک سوشلسٹ مصنف (1808-1871) جو سرمایہ دارانہ نظام پر محض اخلاقی اصولوں کی بنا پر اعتراض کرتا ہے۔

انتخابیت۔پرانے فلسفیوں کا وہ نظریہ جو مختلف مذاہبِ فلسفہ سے مسائل کا انتخاب کرتا ہے۔

دوسرا باب

قاموسی۔مختلف علوم میں ایک ایسی مہارت رکھنے والا۔

ارسطو۔ایک یونانی فلسفی جو 384 ق م میں مقدونیہ میں پیدا ہوا۔اس کا باپ شاہ مقدونیہ کا طبیب تھا۔اس نے بھی طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔وہ اپنی تعلیم کی تکمیل کے لئے 367 ق م میں ایتھنز گیا۔جہاں وہ بیس سال رہا۔اس مدت میں اس کا زیادہ وقت افلاطون کی صحبت میں گزرا۔347 ق م میں افلاطون کی موت کے بعد وہ ایتھنز سے چلا گیا۔343 ق م میں مقدونیہ کے بادشاہ فلپ نے اسے اپنے بیٹے سکندر کی تعلیم کیلئے مقدونیہ آنے کی دعوت دی۔وہ سکندر کی تخت نشینی تک مقدرنیہ ہی رہا335 میں وہ ایتھنز چلا گیا۔جہاں اس نے ایک مدرسہ قائم کیا۔موت سے ایک سال پہلے اُس نے ایتھنز کو چھوڑا۔اس نے 322 ق م میں وفات پائی۔ارسطو نے مختلف علوم وفنون پر کتابیں لکھیں۔ازمنۂ وسطیٰ میں عربوں نے نہ صرف ان کتابوں کے عربی تراجم شائع کئے بلکہ ان میں سے کئی ایک نے ارسطو کے مقالات کی تشریح کی۔ارسطو کے عرب شارحین میں ابنِ ارشد بہت زیادہ مشہور ہے۔

دیکارتے۔فرانس کا ایک فلسفی اور ریاضی دان 1596 میں پیدا ہوا۔فرانس اور جرمنی کی فوجوں میں تھوڑی مدت ملازمت کرنے کے بعد وہ ہالینڈ میں آباد ہوگیا۔1649 میں وہ سٹاک ہوم چلا گیا۔اس نے 1650 میں وفات پائی۔فلسفے کی تاریخ میں اس کا یہ جملہ،''چونکہ میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں'' بہت زیادہ مشہور ہے۔اس کی سب سے مشہور کتاب 'اصولِ فلسفہ' ہے۔اقلیدس میں بھی اس نے چند ایک نئے نظریے قائم کئے تھے۔

سپائی نوزا۔ہالینڈ کا ایک فلسفی(1632-1677)۔جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ہیگ میں صرف کیا،دیکارتے کے فلسفہ کی شرح لکھی۔وہ ہمہ اوست کا قائل ہے۔اس کی مشہور کتاب 'اخلاق' ہے۔

دیدرو۔فرانس کا ایک مشہور لکھنے والا(1751-1765)اس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے 1751 اور 1765 کی درمیانی مدت میں 17 جلدوں میں قاموس انسائیکلوپیڈیا مرتب کی۔دیدرو نے کئی ناول

اور ڈارمے بھی لکھے تھے۔

ہراکلیتس ۔ یونان کا ایک فلسفی جو مابعد الطبیعات کا بانی ہے۔اس نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ کائنات پر آگ کی حکومت ہے۔سب چیزیں اسی سے نکلتی ہیں اور آخر کار اسی میں مدغم ہو جاتی ہیں۔اس نے کہا تھا کہ صرف تغیر ہی کو ثبات ہے۔

عہدِ اسکندریہ۔ چھ سو سال کی اس مدت سے مراد ہے جو تیسری صدی عیسوی تک پھیلی ہوئی ہے۔اسکندریہ کی یونیورسٹی نے مختلف طبعی علوم میں نمایاں کام کئے تھے۔

بیکن ۔فرانس بیکن انگلستان کا مدبر اور مفکر 1561 میں لندن مین پیدا ہوا تھا۔یونانیوں کے بعد بیکن کی کتابوں نے فلسفے میں نمایاں اضافہ کیا۔اس کی کتابوں میں سے مضامین اور اطلاس بہت مشہور ہیں۔اس نے 1646 میں وفات پائی۔

لاک۔ جون لاک۔ مشہور برطانوی فلسفی 1632 میں پیدا ہوا۔لاک اپنے فلسفیانہ خیالات کو اپنی کتاب ''مضامین متعلقہ انسانی فہم'' میں پیش کرتا ہے۔اس کتاب میں وہ بتاتا ہے کہ ہمارا سارا علم تجرباتی ہے۔اس نے فلسفۂ سیاسیات پر بھی بہت کچھ لکھا۔اس نے 1704 میں وفات پائی۔

نیوٹن۔آئی زک نیوٹن۔(1642-1727)انگلستان کا مشہور ریاضی دان فلکیاتی اور فلسفی 1666 میں ایک سیب کے گرنے سے اس کے ذہن میں قانونِ کشش کا خیال پیدا ہوا جسے اُس نے بعد میں مرتب کیا۔اس نے حرکت کے قوانین مرتب کئے اور سفید روشنی یعنی نور کے اجزائے ترکیبی بتائے۔اس کی مشہور کتابوں میں اصول اور بصریات ہیں۔

تصور۔ہیگل اپنے فلسفے میں تصور اور تصورِ کُل سے خدا مراد لیتا ہے۔

لیناس۔کارل لیناس جو بعد میں کارل فان لینی کے نام سے مشہور ہوا۔سویڈن کا ایک ماہر نباتات تھا۔وہ 1707 میں پیدا ہوا۔اس نے 1775 میں وفات پائی۔اس نے نباتات پر بہت سی کتابیں لکھیں۔

لیونز کی شورش۔ 1831 میں لیونز کپجو لاہوں نے ایک ہڑتال کے دوران میں کم سے کم اجرت مقرر کئے جانے کا مطالبہ کیا تھا لیکن مزدوروں پر گولی چلادی گئی تھی۔مزدوروں نے عام بغاوت کردی اور شہر پر قبضہ کرلیا۔جب کارخانہ داروں کی مدد کے لئے فوج پہنچ گئی تو اُس نے مزدوروں کی شورش پر قابو پالیا۔

چارٹسٹ تحریک۔انگلستان کے مزدوروں کی تحریک جس نے انیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں بہت زور پکڑا تھا۔انگلستان کے مزدوروں کی یہ پہلی آزادانہ سیاسی تحریک تھی۔یہ تحریک اس لئے چارٹسٹ کہلاتی ہے کہ 1839 میں مزدوروں نے پارلیمنٹ کے سامنے ایک چارٹر پیش کیا تھا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ:(1)اکیس

سال اوراس سے زیادہ مردوں کو ووٹ دینے کا عام حق دیا جائے۔(2)پارلیمنٹ کا انتخاب ہر سال ہوا کرے۔ (3)پارلیمنٹ کے ممبروں کو تنخواہ دی جائے۔(4)پرچی خفیہ طریقے سے ڈالی جائے۔(5)انتخابی حلقے برابر ہوں۔(6)پارلیمنٹ کا ممبر ہونے کے لئے حساب ملکیت ہونے کا وصف اڑا دیا جائے۔مزدوروں نے ان مطالبات کو منوانے کے کئی سال تک جدوجہد کی جس میں ہڑتال،مظاہرہ اور مسلح بغاوت۔سب کو کام میں لایا گیا۔

مہاجنی معاشیات۔معاشیات کو مہاجنوں ساہوکاروں اور کارخانہ داروں کے مفاد کا محافظ بنا کر پیش کرنے کی کوشش۔

عینیت۔مابعدالطبعیات کا یہ مسئلہ کہ حقیقی وجود صرف تصور کا ہے اور یہ کہ مادی اشیا اسی تصور کے ماتحت ہیں۔فلسفۂ عینیت میں افلاطون۔برکلے اور ہیگل بہت نامور ہیں۔

مارکس۔کارل مارکس(1818-1883)کے معاشی تصورات نے دنیا بھر کی کمیونسٹ تحریکوں کو جنم دیا۔1847 میں مارکس اور اینگلز نے'کمیونسٹ مینی فیسٹو'شائع کیا جس میں انہوں نے کمیونسٹوں کے زاویۂ نگاہ کی وضاحت کی۔1867 میں مارکس کی مشہور کتاب'سرمایہ'کی پہلی جلد چھپی۔مارکس کو اس کے انقلابی خیالات کی وجہ سے جرمنی اور فرانس سے جلاوطن ہونا پڑا۔وہ 1848 میں لندن چلا گیا۔جہاں وہ اپنی موت تک اپنی کتاب 'سرمایہ'لکھنے میں مصروف رہا۔

تیسرا باب

ازمنۂ وسطیٰ۔تاریخ کی ایک اصطلاح جس سے نئے اور پرانے وقتوں کی درمیانی مدت مراد ہے۔عام طور پر یہ مدت 476ء سے شروع ہو کر پندرھویں صدی کے آخر پر ختم ہوتی ہے۔بعض مورخ اسے 1453 پر ختم کرتے ہیں کیونکہ اس سال عثمانی تُرکوں نے قسطنطنیہ(استنبول)فتح کیا تھا۔اور بعض مورخ اس مدت کو 1492 پر ختم کرتے ہیں۔اس سال کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا۔

آلات محنت۔مراد ہے زمین،زرعی اوزار،کارخانہ اور دوسرے اوزار۔

جغرافیائی انکشافات۔پندرھویں صدی کے آخری نصف اور سولھویں صدی کے پہلے نصف کی سمندری دریافتوں کی طرف اشارہ ہے۔1492 میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا اور چھ سال بعد واسکوڈی گاما نے راس اُمید کا چکر کاٹ کر ہندوستان کا نیا بحری راستہ دریافت کیا۔

تجارتی لڑائیاں۔سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں ہندوستان اور امریکہ کی تجارت کو قابو میں لانے کے لئے یورپی ملکوں میں لڑائیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا اُسے تجارتی لڑائیاں کہا جاتا ہے۔ان لڑائیوں میں ہسپانیہ،پرتگال

ہالینڈ،فرانس اور انگلستان شریک تھے۔ان لڑائیوں میں انگلستان جیت گیا۔

ڈارون۔ چارلس رابرٹ ڈارون(1809-1882) نے بیس سال کی محنت کے بعد 1859 میں 'آغازِ انواع' لکھی۔اس کتاب نے سائنس کی تاریخ میں نمایاں تبدیلی برپا کر دی۔ 1851 میں اس نے 'ہبوطِ آدم' لکھی۔ ڈارون کا سب سے اہم نظریہ ''بقاء اصلح'' ہے جس کی رو سے کش مکشِ حیات میں وہی باقی رہتا ہے جو اصلح ہوتا ہے۔

1845-اشارہ ہے اینگلز کی اپنی کتاب 'انگلستان میں مزدوروں کی حالت' کی طرف۔

ولکن اور پرومیتھیئس۔ یونانی دیومالا کے مطابق پرومتھیئس نے اولمپس سے آگ لا کر انسان کو علوم سکھائے۔اس پر آگ کے دیوتا ولکن نے اُسے ایک پہاڑ کے ساتھ جکڑ دیا۔ایک گِدھ دن بھر اس کے جگر گوشت نوچتا رہتا اور رات کے وقت گوشت کے یہ ٹکڑے اس کے جسم پر دوبارہ اُگ آتے تھے۔ ہرکولیس نے اس گدھ کو مار کر اس کو اذیت سے نجات دلائی تھی۔

برائی کا چکر۔مراد ہے ایک ایسے چکر سے جس میں ایک برائی کو ختم کرنے کے لئے کئی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

انارکسٹوں۔اشارہ ہے پرودھوں اور باکونین اور ان کے ماننے والوں کی طرف،جن کا یہ مطالبہ تھا کہ ریاست کو چشمِ زدن میں ختم کر دیا جائے۔

اس کتاب کو مارکسسٹ انٹرنیٹ آرکائیو کے اردو سیکشن marxists.org کے لئے ابن حسن نے ترتیب دیا۔

کمپوزنگ۔جواد بٹ

نظر ثانی ترجمہ: ابنِ حسن

پروف ریڈنگ: ابوذر وسیم

ہم سے رابطہ کے لئے: **hasan@marxists.org**